انوشا کا خواب

انوشا کی آپ بیتی　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　نواں حصّہ

انوشا کا خواب

بچوں کے لئے ناول

محمد یونس حسرت

فیروز سنز پرائیویٹ لمیٹڈ

پہلی بار ۱۹۷۹

تعداد ۴۰۰۰

قیمت ۴۔۰۰

فہرست

شنکر چنڈال

میں ٹیکسلا کے در و دیوار کو حیرانی سے تک رہا تھا۔ یہ وہ در و دیوار نہیں تھے جن سے میری آنکھیں آشنا تھیں۔ وہ محل جس کے ایک کمرے میں، مَیں نے آنکھ کھولی تھی، وہ شاہی مہمان خانہ جہاں ہم سکندر کے مہمان رہے تھے۔ وہ سرائے جہاں سے راجا امبھی کے سپاہی ہمیں پکڑ کر سکندر کے پاس لے گئے تھے۔ سب کھنڈر بن چُکے تھے۔ یہی نہیں سارا شہر کھنڈر بن چُکا تھا اور اُس کے بجائے تھوڑی سی دُور ایک نیا ٹیکسلا وجود میں آچکا تھا۔

تکشک مندر بھی کھنڈر بن چُکا تھا اور اِس کے ساتھ کا وہ میدان جہاں سکندر کے سامنے میرا پانچ سپیروں کے ساتھ خوف ناک مُقابلہ ہوا تھا، اب مرگھٹ کے طور پر استعمال ہو رہا تھا۔ لوگ اپنے مُردوں کو جلانے کے لیے یہاں لاتے تھے۔ اِس وقت بھی کہ آدھی رات بیت چُکی تھی اور آسمان پر چودھویں کا چاند چمک رہا تھا، میدان کے ایک کونے میں لکڑیوں کی چِتا پر ایک لاش رکھی دِکھائی دے رہی تھی۔ لاش کے آس پاس سیکڑوں لوگ جمع تھے۔ اُنہوں نے ابھی تک چِتا کی لکڑیوں کو آگ نہیں دِکھائی تھی۔ شاید وہ کسی کے آنے کا انتظار کر رہے تھے۔ جیسے ہی ہم میدان کے پاس پہنچے، چار پانچ آدمی دوڑتے ہوئے ہماری طرف آئے، ہمیں سر سے پاؤں تک دیکھا اور پھر ایک شخص بولا۔ ”کیا آپ سارنگ بابا اور انوشا جی ہیں؟“

”کیوں؟ کیا بات ہے؟“ سارنگ بابا نے پوچھا۔

”پہلے یہ بتائیے، کیا آپ ہی سارنگ بابا اور انوشا جی ہیں؟“

”ہاں، ہمیں ہی سارنگ بابا کہتے ہیں اور یہ ہمارا بیٹا انوشا ہے۔“

”تو جلدی آیئے۔“اُس شخص نے کہا۔ اور ہمیں شنکر کی وصیّت کے مطابق اُس کی چِتا کو آگ لگانے کی اجازت دیجیے۔ ہم تین دِن سے آپ کی راہ دیکھ رہے ہیں۔“

اور اِس کے ساتھ ہی تمام لوگوں میں ایک شور سا مچ گیا۔

”آ گئے! سارنگ بابا آ گئے! انوشا جی آ گئے۔“

میں حیران رہ گیا، سوچنے لگا کہ کیا ہمارے ساتھ ایک بار پھر وہی معاملہ پیش آنے والا ہے جیسا کہ بھوگ متی کے راجاناگ سین کے بھائی کی لاش پر پیش آیا تھا۔ وہاں مُجھے راجاناگ سین کے بھائی کی لاش کے ساتھ خوفناک لڑائی کے بعد اُس کی زبان حاصل کرنا پڑی تھی۔ کیا یہاں بھی ایسا ہی ہونے والا ہے؟

لیکن نہیں، یہاں معاملہ کُچھ اور ہی تھا۔ اِس سے پہلے کہ سارنگ بابا چِتا کی لکڑیوں کو آگ دِکھانے کی اجازت دیتے، اُنھوں نے لوگوں سے سارا ماجرا بیان کرنے کو

کہا اور اُنہوں نے جلدی جلدی ساری بات سُنا ڈالی۔

معاملہ بڑا ہی عجیب اور پُر اسرار تھا!

اُس کا نام شنکر تھا اور وہ ایک سیدھا سادہ نوجوان تھا۔ اُسے شوق تھے تو صرف دو، دیوی دیوتاؤں کی مُورتیاں بنانا اور دریا میں نہانا۔ اُس کی بنائی ہوئی مُورتیاں بڑی عمدہ ہوتی تھیں۔ یُوں معلوم ہوتا تھا جیسے ابھی بول پڑیں گی۔ لوگ اُنہیں ہاتھوں ہاتھ خریدتے تھے۔

ایک روز وہ نہانے کے لیے دریا پر گیا تو وہاں اُس کے ساتھ ایسا معاملہ پیش آیا جو اُس کے وہم و گمان میں بھی نہیں آسکتا تھا۔ اُس نے دریا میں غوطہ لگایا تو اُس کا سر کسی سخت چیز سے ٹکرایا اور وہ بے ہوش ہو گیا۔ ہوش آیا تو اُس نے اپنے اِرد گرد حیرانی سے دیکھا۔ یہ کوئی نیا ہی گھر تھا۔ اُس کے ماں باپ نِیچ ذات کے لوگ تھے، جنہیں چنڈال یا چنگڑ کہا جاتا ہے۔ یہ لوگ کسی ایک جگہ رہنے کے بجائے شہر شہر، بستی بستی پھِرتے ہیں اور ہر اَلا بَلا یہاں تک کہ سانپ، چھپکلیاں اور کچھوے تک کھا

جاتے ہیں۔

یہ لوگ پھٹی پُرانی چادریں تان کر خیمے بنا لیتے ہیں اور ان کے نیچے سو رہتے ہیں۔ مرد محنت مزدوری کر کے چار پیسے کما لیتے ہیں۔ عورت میں سرکیاں اور چھاج وغیرہ بنا کر بیچتی ہیں یا بھیک مانگتی پھرتی ہیں اور داؤ لگے تو چوری بھی کر لیتی ہیں۔ اُن دِنوں اُن کا ڈیرا ایک گاؤں کے قریب ہی تھا۔

کُچھ دِنوں بعد شنکر کے قبیلے کے گاؤں سے کوچ کیا اور جنگل کی راہ لی۔ وہ بھی دوسرے چنگڑوں کی طرح درختوں کی جڑیں، پھل اور جانوروں کا گوشت کھاتا۔ اُسے سرکیاں اور چھاج بنانا بھی آتا تھا اور ساتھ ہی چوری کرنے اور ہاتھ کی صفائی دِکھانے کے طریقے بھی خوب جانتا تھا۔

اُس کے جسم سے چُستی، چالاکی اور طاقت ظاہر ہوتی تھی۔ رنگ توے کی طرح سیاہ، لمبے لمبے جن میں کنگھی کرنے کی نوبت مہینوں تک نہیں آتی تھی۔ برسوں میں کہیں ایک آدھ جوڑا بنتا تھا اور جب تک وہ تار تار نہ ہو جاتا، جسم پر سے نہیں

اُترتا تھا۔

قبیلے میں اُس کے نشانے کی بڑی شہرت تھی۔ اُس کا نشانہ کبھی خطا نہیں جاتا تھا۔ نگاہ بھی بڑی تیز تھی اور بھاگتا دوڑتا بھی خوب تھا۔ اُس کے ہاتھ کی چالاکی اور صفائی کی بھی بہت دھوم تھی۔ ایک بار گاؤں میں اُس کی ماں نے کسی دُکان سے لوٹا چُرایا، لیکن لے جانے نہ پائی تھی کہ مالک نے دیکھ لیا اور وہ اُسے پکڑ کر تھانے لے گیا۔ شنکر بھی اُس کے ساتھ تھا۔ تھانے میں جاکر مالک نے لوٹا زمین پر رکھا ہی تھا کہ شنکر نے فوراً اپنے ہاتھ کی صفائی دِکھائی، لوٹا اُٹھا کر اپنی بہن کے حوالے کر دیا اور وہ لے کر چلتی بنی۔ اُس کے بعد شنکر اور اُس کی ماں رو رو کر فریاد کرنے لگے کہ یہ امیر لوگ جھوٹے الزام لگا کر ہمیں تنگ کرتے ہیں۔ مالک کو لوٹا نہ ملا تو وہ سٹپٹایا۔ تھانے دار نے سمجھا کہ اُس نے شنکر اور اُس کی ماں پر چوری کا جھوٹا الزام لگایا ہے۔ اُس نے مالک سے ایک ایک روپیہ اُن دونوں کو دِلوایا۔

شنکر کی زندگی اِس طرح گُزر رہی تھی کہ ایک بار جنگل میں اُنہیں چنگڑوں کا ایک

اور قبیلہ ملا۔ دونوں قبیلوں میں پہلے سے میل مُلاقات تھی اِس لیے سب مل کر بہت خوش ہوئے۔ دونوں قبیلوں کے لوگ جلد ہی گھُل مِل گئے اور آپس میں شادی بیاہ کرنے لگے۔ شنکر کی شادی بھی اُس قبیلے کی ایک لڑکی سے ٹھہر گئی، جس کا نام چنڈی تھا۔ اُس کی عُمر کوئی اٹھارہ سال تھی۔ رنگ شنکر کی طرح ہی توے جیسا کالا سیاہ تھا۔ بالوں میں مہینے بھر سے کنگھی نہیں ہوئی تھی اور نہائے ہوئے بھی شاید اتنے ہی دِن ہو گئے تھے۔ سر پر ایک میلی چادر تھی جو جگہ جگہ سے پھٹی ہوئی تھی۔

اب مُشکل یہ پیش آئی کہ نہ دُولھا کے لیے کپڑے تھے اور نہ دلہن کے پاس۔ آخر صلاح یہ ٹھہری کہ کسی بستی میں چلیں اور وہاں شادی کا سامان کریں۔

دونوں قبیلے وہاں سے چل کھڑے ہوئے اور تین چار روز کے سفر کے بعد ایک بستی کے قریب پہنچ کر ڈیرے ڈال دیے۔ وہاں دولہا دلہن کے لیے دو دو جوڑے تیّار ہوئے۔ چاندی کا معمولی قیمت کا ایک ایک زیور دونوں طرف سے دُلہن کو دیا

گیا۔ شادی سے ایک دِن پہلے دعوت کی ٹھہری۔ دعوت کا سامان کرنا تو اُن لوگوں کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ شنکر کا باپ اور سُسر، ماں اور ساس آس پاس کی بستیوں سے کُچھ مُرغ اور ایک بکری چُرا لائے۔ اِس طرح کئی قسم کا گوشت مٹّی کی ہانڈیوں میں پک کر تیّار ہوا اور رات کے وقت دونوں قبیلے دعوت میں اکٹھّے ہوئے۔ مرد ایک طرف اور عورتیں ایک طرف۔

دعوت کے دوران ایک شخص نے مذاق میں ذرا چُبھتی ہوئی بات کہی تو دوسرے نے جواب میں گالی دے دی۔ بس تھوڑی ہی دیر میں شادی کی دعوت میں جوتا چلنے لگا اور سب سے زیادہ پٹے بھی شنکر کا باپ اور سُسر۔ بڑے بُوڑھوں نے بڑی مُشکل سے بیچ بچاؤ کرایا تو سب لوگ رو رو کر ایک دوسرے سے گلے ملنے اور معافیاں مانگنے لگے۔ رات گئے دعوت ختم ہوئی۔ کُچھ اپنے ٹھکانوں پر گئے اور کُچھ وہیں لیٹ رہے۔ دوسرے دِن دوپہر کو شنکر اور چنڈی کی شادی ہو گئی۔

اب شنکر اپنی بیوی کے ساتھ رہنے لگا۔ چنڈی کے جہیز میں شنکر کو ایک مریل سا

گدھا ملا تھا۔ اُس کا اتنا فائدہ ہوا کہ اُسے اپنا مال اسباب پیٹھ پر اُٹھا کر نہیں لے جانا پڑتا تھا۔ شادی کے ڈیڑھ سال بعد اُن کے ہاں لڑکا پیدا ہوا۔ اِس موقع پر ویسی ہی دعوت ہوئی جیسی اُس کی شادی کے موقع پر ہوئی تھی۔

اِس طرح شنکر کی زندگی کے پچاس برس پورے ہوئے۔ وہ اپنے قبیلے کے ساتھ ایک بستی کے قریب ٹھہرا ہوا تھا کہ قبیلے میں بیماری پھیل گئی۔ اِن کے کپڑے گندے، جسم گندے، رہنے کی جگہ گندی، ان میں بیماری نہ پھیلتی تو اور کہاں پھیلتی۔ روز دو دو چار چار موتیں ہونے لگیں تو قبیلے نے بستی سے اُٹھ کر جنگل کی راہ لی لیکن بیماری اُن کے ساتھ ساتھ تھی۔ چلے تو تین مردوں اور دو عورتوں کو بخار چڑھا ہوا تھا۔ وہ جنگل میں پہنچنے سے پہلے ہی چل بسے۔ جنگل میں جا کر ڈیرا کیا تو شنکر کے سوا سب کو بخار تھا اور دوسرے ہی روز وہ سب کے سب موت کی نیند سو گئے۔ شنکر اکیلا اِتنی لاشوں کو کیسے ٹھکانے لگا سکتا تھا۔ اُس نے اُن سب کو جنگلی جانوروں کے رحم و کرم پر چھوڑا اور آپ ایک طرف کو چل دیا۔

وہ سوچ رہا تھا کہ دم کے دم میں کیا سے کیا ہو گیا۔ پچاس ساٹھ آدمی دیکھتے ہی دیکھتے موت کے مُنہ میں چلے گئے۔ میرے ماں باپ، میری بیوی، چھ لڑکے جن میں سے چار گبھرو جوان تھے اور جو بڑھاپے میں میرا سہارا بننے والے تھے اور چار لڑکیاں چلی گئیں اور ایک میں ایسا سخت جان اور ڈھیٹ ہوں کہ مُجھے موت نہیں آئی۔ کاش کوئی شیر ہی آکر مُجھے کھالے!

شنکر کی دُنیا اندھیر ہو چکی تھی۔ غم ایسا سخت تھا کہ آنکھوں سے آنسو بھی نہیں نکل سکتے تھے۔ اِسی حال میں وہ کتنے ہی دِنوں تک سفر کرتا رہا۔ درختوں کی جڑیں اور پھل کھاتا، اور بہتی ندیوں اور چشموں کے پانی سے پیاس بجھاتا۔ کوئی ڈیڑھ مہینے کے سفر کے بعد کسی آبادی کے آثار نظر آئے تو وہ اُس کی طرف چل دیا۔ اُس کی عمر پچاس سال سے اوپر ہو گئی تھی مگر جنگل کی ہوا اور محنت مشقّت کی زندگی کی بدولت صحت اچھّی تھی اور جسم جوانوں کی طرح سیدھا اور طاقت ور تھا۔ اُس کی دھوتی اور کرتا میلے اور جگہ جگہ سے پھٹے ہوئے تھے۔ نہ سر پر پگڑی تھی اور نہ پاؤں میں جوتا۔ وہ تو فقیروں سے بھی خراب حال میں تھا۔

شنکر نے دیکھا کہ بہت سے لوگ ایک میدان میں جمع ہیں۔ وہ بھی اُسی طرف چل دیا۔ اِس علاقے کا رواج یہ تھا کہ جب کوئی راجا بغیر کوئی اولاد چھوڑے مر جاتا تھا تو راجدھانی کے لوگ اِس میدان میں جمع ہو جاتے اور ایک ہاتھی کو چھوڑ دیتے۔ ہاتھی اپنی سونڈ سے جس نے شخص کو اُٹھا کر اپنے اوپر بِٹھا لیتا تھا، لوگ اُس کو اپنا راجا مان لیتے تھے۔ اِس علاقے کا راجا بے اولاد مر گیا تھا۔ مگر شنکر کو اِس بات کی کُچھ خبر نہ تھی۔ وہ سمجھا کہ یہاں کوئی تماشا ہو رہا ہے۔ وہ بھی جا کر کھڑا ہو گیا۔

ہاتھی تمام لوگوں کے سامنے سے ہوتا ہوا اُس جگہ آیا جہاں شنکر کھڑا تھا، تو اُس نے ایک دم سُونڈ آگے کی اور شنکر کو اُٹھا کر اپنی پیٹھ پر بِٹھا لیا۔ اِس کے ساتھ ہی لوگوں نے خوشی سے نعرے لگانے شروع کر دیے۔ اِن نعروں کا مطلب تھا کہ لوگوں نے شنکر کو اپنا راجا مان لیا ہے، مگر شنکر تھا کہ ڈر کے مارے چلّائے جا رہا تھا۔ آخر مہاوت ہاتھی کی دُم پکڑ کر اُوپر چڑھا اور شنکر کو سہارا دے کر بولا۔

"مہاراج! گھبرائیے نہیں۔ یہ ہاتھی ہلا ہوا ہے۔ آپ ہمارے راجا ہیں۔ یہ آپ کو کُچھ نہیں کہے گا۔"

شنکر مہاوت کی یہ بات سُن کر حیران ہوا اور ابھی کوئی اور بات نہ کرنے پایا تھا کہ ایک شخص نے بُلند آواز سے کہا۔

"اب سب لوگ چلے جائیں اور اپنے گھروں اور بازاروں کو سجائیں۔ راجا جی کی سواری کا جُلُوس شام کے وقت نکلے گا۔"

یہ سُن کر شہر کے لوگ اپنے اپنے گھروں کو سِدھارے اور دربار کے امیروں وزیروں نے آ کر شنکر کو ادب سے سلام کر کے کہا۔ "آپ ہمارے راجا ہیں اور ہم آپ کی پرجا۔ ہمارے حال پر مہربانی کی نظر رکھنا حُضُور!"

شنکر حیران تھا کہ میں جاگتا ہوں یا کوئی خواب دیکھ رہا ہوں۔ کہاں وہ کنگال شنکر جو کل تک روٹیوں تک کا محتاج تھا اور کہاں یہ شنکر جس کے سامنے سارے امیر وزیر

سر جھکا رہے ہیں۔

وزیر شنکر کو لے کر محل میں پہنچے تو وہاں لونڈیاں باندیاں سر جھکا جھکا کر سلام کرنے لگیں۔ راجا کے لیے غُسل کا سامان پہلے سے تیّار تھا۔ نوکروں چاکروں نے غُسل کرایا، اچھّے اچھّے کپڑے اور قیمتی ہار اور کنگن پہنائے، اُس کے بدن کو طرح طرح کی خوشبوؤں میں بسایا اور قسم قسم کے مزے دار کھانے سونے چاندی کے برتنوں میں سجا کر سامنے لا رکھے۔ شنکر نے ایسے کھانے کبھی خواب میں بھی نہ دیکھے تھے۔ خُوب پیٹ بھر کر کھایا اور پھر ایک شان دار پلنگ پر پڑ کر سو رہا۔

سہ پہر کو وہ سو کر اُٹھا تو شام کے جلُوس کے لیے تیّاری ہونے لگی۔ امیر اور وزیر آ کر مبارک باد دینے لگے اور ساتھ ہی اُنھوں نے اُس کا حال دریافت کیا۔ اس پر شنکر نے کہا۔

”تم لوگوں نے مجُھے اپنا راجا مان لیا ہے اور مجُھے گدّی پر بِٹھا چکے ہو۔ اب یہ پوچھنے سے کیا فائدہ کہ میں کون ہوں؟ خبر دار! آیندہ کوئی مجُھ سے اِس قسم کا سوال نہ

کرے۔"

اُس کی یہ بات سُن کر سب خاموش ہو گئے اور پھر کسی نے اِس قسم کی بات نہ کی۔

شہر کے بڑے بڑے بازاروں میں شنکر کی سواری کا جلُوس نکلا۔ ہاتھیوں پر سونے چاندی کے ہودے اور ریشمی جھُولیں تھیں۔ گھُڑ سواروں کے دستے، سنہری روپہلی رتھیں، امیروں وزیروں کی سواریاں اور پیاروں کی قطاریں، بڑا دِل چسپ نظّارہ پیش کر رہی تھیں۔ سارے بازار دُلہن کی طرح سجے ہوئے تھے۔ جگہ جگہ خوبصورت دروازے بنائے گئے تھے۔ لوگ خوبصورت لباس پہنے بازاروں میں پھِرتے تھے یا اپنے مکانوں کی کھڑکیوں میں بیٹھے جلُوس کی رونق دیکھ رہے تھے۔ جگہ جگہ شنکر کی سواری پر پھول برسائے گئے اور زندہ باد کے نعرے لگائے گئے۔

آدھی رات کے بعد راجا کی سواری شہر کا چکّر لگا کر محل میں واپس آئی۔ اور لوگ تو اپنے اپنے گھر آرام سے سو رہے لیکن شنکر کی آنکھوں میں نیند کہاں۔ وہ رہ رہ

کر سوچتا تھا کہ جاگ رہا ہوں یا خواب دیکھ رہا ہوں! کہاں وہ شنکر چنڈال جس کے پاس نہ رہنے کا ٹھکانا تھا نہ کھانے کا سامان اور کہاں میں شنکر جو ایک ریاست کا راجا ہے، سارا شہر اُس کے نام کی مالا جپ رہا ہے!

اگلے دِن قسم قسم کے سازوں کی پیاری پیاری آوازوں نے شنکر کو نیند سے جگایا اور جب اُس نے آنکھیں کھولیں تو ساز بجانے والوں نے ادب سے جھُک کر اُسے سلام کیا۔ شنکر اُٹھا اور نہا دھو، لباس بدل، دربار میں جا بیٹھا۔ وزیرِ اعظم نے کاغذات پیش کرنے شروع کیے۔ پہلا کاغذ ایک شخص کو کسی شہر کا حاکم مقرّر کرنے کا تھا۔ شنکر نے پہلے ہی دِل میں ٹھان لی تھی کہ میں راج پاٹ کے معاملوں میں دخل دینے کے بجائے سارا کام وزیروں پر چھوڑ دوں گا۔ اِس طرح کام بھی چلتا رہے گا اور یہ لوگ مُجھ سے خوش بھی رہیں گے۔ اُس نے وزیرِ اعظم سے پوچھا۔

”آپ کی اِس بارے میں کیا رائے ہے؟“

وزیرِ اعظم نے جواب دیا۔ ”مہاراج! یہ شخص بہت لائق اور راج دربار کا وفادار ہے، بے شک اُسے مقرّر کر دیجئے۔“

شنکر نے کہا۔ ”منظور ہے۔“

شنکر کا خیال تھا کہ منظور ہے کہنے سے بات ختم ہو جائے گی، مگر وزیرِ اعظم نے کاغذ کی طرف اِشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”مہاراج! اِس پر دستخط فرما دیجیے۔“

اس پر شنکر کے مُنہ سے بے اختیار نکل گیا۔ ”میں تو اَن پڑھ ہوں۔ لکھنا جانوں نہ پڑھنا۔“

وزیرِ اعظم یہ سُن کر چونکا تو سہی لیکن آدمی سمجھ دار تھا۔ کہنے لگا۔ ”مہاراج، یہ ریاست مایانگر کہلاتی ہے۔ اب تک اِس کے چھ راجا ہو چکے ہیں۔ لکھنے پڑھنے کا کیا ہے۔ آدمی معمولی سی کوشش سے سب کُچھ سیکھ لیتا ہے۔“ اِس کے بعد راجا کو لکھنا پڑھنا سکھانے کے لیے اُستاد مقرّر ہو گئے۔ تھوڑے ہی دِنوں میں وہ ایسا

لائق فائق بن گیا جیسے اُس کے باپ دادا ہمیشہ سے راج کرتے آئے ہوں۔

شنکر نے غریبی کے دِن دیکھے تھے۔ وہ غریبوں اور محتاجوں کو دِل کھول کر خیرات دیتا تھا۔ اِس لیے لوگ اُسے بہت پسند کرتے تھے۔ اُس کی کئی رانیاں تھیں۔ ایسی عیش بھری زندگی کبھی اُس نے خواب میں نہیں دیکھی تھی۔

شنکر کو مایا نگر میں راج کرتے دس برس ہونے کو آئے تھے۔ گو اُس کی عمر ساٹھ برس سے اوپر ہو چکی تھی مگر اُس کی صحت ویسی ہی اچھّی تھی۔ اُس کے ہاں چار لڑکے اور دو لڑکیاں پیدا ہوئیں اور اُن کی پیدائش میں بڑے بڑے جشن منائے گئے۔

مایا نگر کا دسہرے کا میلا بڑا مشہور تھا۔ یہ میلا بڑی دھوم دھام سے ہوتا تھا اور دور دور سے لوگ اُس کو دیکھنے آتے تھے۔ راجا خُود جلُوس کے ساتھ میلے میں شامل ہوتا تھا۔ ایک روز شنکر میلے سے واپس آ رہا تھا۔ لوگوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ کھڑے راجا کی سواری کا تماشا دیکھ رہے تھے۔ ایک طرف چنگڑ بھی کھڑے

تھے۔ اُن میں سے ایک نے راجا کو دیکھا اور پھر اپنے ساتھی سے کہنے لگا:

"ارے کوڈو! ہو نہ ہو یہ راجا تو وہی ہمارا شنکر ہے جس کی شادی میری ماسی کی بیٹی چنڈی سے ہوئی تھی!"

یہ سُن کر دوسرے چنگڑ نے کہا۔ "ارے وہی شنکر جس کا باپ اور سُسر جوتیوں سے پٹے تھے؟ ارے ہاں معلوم تو وہی ہوتا ہے۔ یہ راجا کیسے بن گیا!"

چنگڑوں نے یہ باتیں اتنی اُونچی آواز سے کہی تھیں کہ نہ صرف آس پاس کے لوگوں نے نہیں بلکہ وزیرِ اعظم اور خود شنکر کے کانوں میں بھی پڑیں۔ شنکر نے فوراً اُن دونوں کو گرفتار کرنے کا حکم دے دیا۔ لوگوں نے اُن کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں دیکھیں تو پوچھا کہ اُنھوں نے کیا کیا ہے۔ سپاہیوں نے اُنہیں بتایا کہ یہ راجا کو چنگڑ کہتے تھے۔ یہ بات سارے شہر میں پھیل گئی اور چھوٹے بڑے سب کو معلوم ہو گیا کہ اُن کا راجا ذات کا چنگڑ ہے۔ جگہ جگہ اِس بات کا چرچا ہونے لگا۔ چنگڑ گرفتار ہو کر شنکر کے سامنے پیش ہوئے تو وزیرِ اعظم کے علاوہ تمام بڑے

بڑے عہدے دار بھی دربار میں موجود تھے۔ شنکر نے رعب دار آواز میں چنگڑوں سے پوچھا:

"تم نے ہمارے بارے میں کیا کہا تھا؟"

یہ سُن کر کوڈو بولا۔ "مہاراج! آپ کی صورت اور آواز بالکل اُس شنکر سے ملتی جلتی ہے جو میری ماسی کی بیٹی چنڈی کا خاوند تھا۔ یہی بات ہم نے اُس وقت کہی تھی اور یہی اب کہتے ہیں، چاہے ہمیں مارو یا چھوڑ دو۔"

یہ سُن کر پچھلی زندگی کے سارے واقعات شنکر کی نگاہوں میں پھِر گئے اور وہ دیر تک خاموش رہا۔ اُس کی خاموشی سے تمام درباری بھانپ گئے کہ راجا حقیقت میں چنگڑ ہے اور انہی چنگڑوں کا رشتے دار ہے۔ وزیرِ اعظم نے کہا۔ "مہاراج، بڑے آدمی سچّائی کو کبھی نہیں چھپاتے۔ ہمارا خیال ہے کہ یہ لوگ واقعی آپ کے رشتے دار ہیں۔"

آدمی کی شامت آتی ہے تو اُس کی عقل ماری جاتی ہے۔ شنکر کے مُنہ سے نکلا۔ ”تم اُنہیں ہمارا رشتے دار سمجھتے ہو تو انعام دے کر رُخصت کرو اور اِن سے کہہ دو کر دوبارہ یہاں نہ آئیں۔“

وزیرِ اعظم نے دونوں چنگڑوں کو انعام دے کر رُخصت کیا۔ شہر میں راجا کے چنگڑ ہونے کی افواہ پہلے ہی پھیل چکی تھی۔ اب لوگوں نے وزیروں اور دوسرے عہدیداروں کے پاس آ آ کر پوچھنا شروع کیا، اور جب اُنہیں بھی یہی کہتے سُنا کہ راجا واقعی ذات کا چنگڑ ہے تو سب کو بڑا دُکھ ہوا۔ وزیرِ اعظم اور دوسرے امیر وزیر اور اُونچے عہدے دار راجا کے ساتھ کھاتے پیتے رہے تھے، اور دوسرے لوگوں نے اُن عہدے داروں کے ساتھ کھایا پیا تھا۔ تمام شہر والے ایک جگہ جمع ہوئے اور کہنے لگے یہ تو بڑا غضب ہوا کہ ہم ایک چنڈال اور چنگڑ کا کھانا کھاتے رہے ہیں۔ ہمارا دھرم برباد ہو گیا اور اگر ہم نے اِس کے لیے کُچھ نہ کیا تو مرنے کے بعد ہمیشہ کے لیے دوزخ کی آگ میں جلیں گے۔

اِس پر سب نے صلاح کی کہ آگ میں جل کر اپنے آپ کو پاک صاف کر لیں تا کہ اگلے جہان میں دوزخ کی آگ سے بچ جائیں۔

راجا کے محل کے پاس ایک بڑا سا تالاب مرمّت کے واسطے خُشک کیا گیا تھا۔ لوگوں نے وہاں لکڑیوں کے ڈھیر لگانا شروع کیے۔ گھروں کے کواڑ، تختے، چھت کی لکڑیاں، غرض جہاں جہاں سے بھی لکڑی ملی، لالا کر اُس تالاب میں ڈال دی اور لکڑیوں کو آگ دِکھا دی۔ جب آگ خوب دہک گئی تو سب سے پہلے وزیرِ اعظم اُس میں کودا، اور اُس کے بعد ہزاروں عورتیں، مرد، چھوٹے بڑے، بچّے بُوڑھے اُس میں اِس طرح کودنے لگے جیسے پتنگے چراغ پر گِرتے ہیں۔

شنکر اپنے محل کی کھڑکی میں بیٹھا یہ خوف ناک نظّارہ دیکھ رہا تھا۔ لوگوں کو یوں دھڑا دھڑ آگ میں کودتے دیکھ کر اُس کا دِل اُسے ملامت کرنے لگا۔

"ارے پاپی! تیری وجہ سے شہر کا شہر جل مرا۔ تُجھے کُچھ بھی شرم ہو تو تُو بھی اِسی آگ میں جل کر مر جا۔"

دِل کی یہ لعنت ملامت شنکر سے برداشت نہ ہو سکی اور اُس نے بھی محل کی کھڑکی سے آگ کے اُس دہکتے ہوئے الاؤ میں چھلانگ لگا دی!

آگ کی گرمی سے اُسے تکلیف ہوئی تو وہ اُچھل پڑا۔۔۔ کیا دیکھتا ہے کہ نہ مایا نگر ہے نہ مایا نگر کا محل، نہ آگ کا الاؤ ہے اور نہ لوگ اُس میں کود کود کر جانیں دے رہے ہیں۔ بلکہ اُس نے تو دریا کے ٹھنڈے پانی میں غوطہ لگا کر سر اُبھارا ہے! اُس کے کپڑے کنارے پر پڑے تھے۔ غوطہ لگا کر اُبھرنے میں دیر کتنی لگتی ہے، لیکن اِس ذرا سی دیر میں وہ کیا کیا دیکھ آیا تھا! چنڈالوں کے ساتھ اتنی زندگی گزارنا، چنڈال لڑکی چنڈی سے شادی کرنا، چھ لڑکوں اور چار لڑکیوں کا باپ بننا، پھر سارے خاندان کا مرنا، دس برس مایا نگر پر حکومت اور پھر آگ کے الاؤ میں جل کر خاتمہ۔ وہ حیرت زدہ دریا سے نکلا، کپڑے پہنے اور گھر کی طرف چل دیا۔

راستے بھر وہ یہی سوچتا رہا کہ کوئی دوست ملے تو اُسے یہ عجیب و غریب ماجرا سناؤں۔ گھر پہنچا تو اُس کا بچپن کا دوست منوہر اُس کا انتظار کر رہا تھا۔ شنکر اُسے

دیکھ کر بہت خوش ہوا اور کہنے لگا۔

”ارے منوہر! اتنے دِنوں کہاں ہے؟ کوئی دو ڈھائی سال بعد تمہاری شکل دیکھ رہا ہوں۔ تم کمزور بھی بہت ہو گئے ہو!“

منوہر نے جواب دیا۔ ”یہ تو تُم جانتے ہو کہ مُجھے دیس دیس پھِرنے کا شوق ہے۔ اِس دفعہ میں پھِرتے پھِرتے ایک عجیب سے شہر میں جا نکلا تھا۔ یہ شہر بڑا عالی شان تھا۔ بازار بڑے کھُلے کھُلے، مکان سب پکّے، دو دو منزلہ اور تین تین منزلہ، باغ، کنوئیں اور تالاب جگہ جگہ، لیکن آدمی کا کہیں نشان نہیں۔ سب مکان کھُلے پڑے تھے اور اُن میں مال اسباب جُوں کا تُوں رکھا ہوا تھا۔ میں حیران ہو رہا تھا کہ یہ کیا ماجرا ہے! گھُومتا پھِرتا بڑے بازار سے گُزر کر راجا کے محل تک جا پہنچا۔ محل نہایت ہی شان دار تھا۔ اُس کے شمال کی طرف ایک لمبا چوڑا میدان تھا۔ جس میں ایک بڑا سا تالاب تھا۔ اُس کے کنارے دو آدمی کھڑے تھے۔ میں وہاں پہنچا تو دیکھا کہ تالاب میں پانی بالکل نہیں ہے اور وہ راکھ سے بھرا ہوا ہے۔ میں نے

اُن لوگوں سے پوچھا کہ کیا یہ جنوں، بھُوتوں کا شہر ہے، اور تُم بھی آدمی ہو یا کوئی بھُوت پریت ہو؟ آخر یہ اتنا بڑا شہر ویران کیوں ہے؟

ایک آدمی نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔ کُچھ نہ پوچھو۔ یہاں ایسا سخت پاپ ہوا ہے کہ کہیں نہ ہوا ہو گا۔ یہ بڑا آباد شہر تھا اور یہاں بڑے بڑے راجا ہو گُزرے ہیں۔ یہ محل اور تالاب انہی کے ہیں۔ سب سے آخری راجا ایک چنڈال تھا جو یہاں دس برس تک راج کر تا رہا۔ سب اُس کے ساتھ کھاتے پیتے رہے اور کسی معلوم نہ ہوا کہ راجا نیچ ذات کا ہے۔ پھر اُس کے رشتے دار چنگڑ آئے اور اُنہوں نے بھانڈا پھوڑ دیا۔ لوگوں کو معلوم ہوا تو اُنہیں اپنا مذہب خراب ہونے کا بڑا دُکھ ہوا اور وہ آگ میں جل جل کر مر گئے۔ انہی کے ساتھ وہ نیچ چنڈال بھی جل کر مر گیا۔ ہم پاس کے گاؤں کے رہنے والے ہیں۔ اِدھر سے گُزرے تو یہاں کھڑے ہو گئے۔

اُن لوگوں کی زبانی اتنے آدمیوں کے جل مرنے کا سُن کر مجُھے سخت رنج ہوا۔

اِتنی مدّت تک تُم سے نہ ملنے کی بھی یہی وجہ ہے۔ میں سیدھا اُسی مقام سے آ رہا ہوں۔"

منوہر سے یہ حال سُن کر شنکر کا اوپر کا سانس اُوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ حیرانی کے مارے اُس سے بولا نہیں جاتا تھا۔ منوہر نے شنکر کی حیرانی بھانپتے ہوئے کہا۔

"شنکر بھیّا، مُجھے بھی تمہاری طرح حیرانی ہوئی تھی، مگر قُدرت کا یہ کارخانہ ایسی ہی عجیب چیزوں سے بھرا پڑا ہے۔"

شنکر کہنے لگا۔ "میرے دوست، مایا نگر کا یہ شہر یہاں سے کسی طرف اور کتنی دور ہے؟"

منوہر نے کہا۔ "معلوم ہوتا ہے تمہارا وہاں جانے کا اِرادہ ہے۔ ہاں بھی ایسے عجیب شہر کا حال سُن کر کس کا جی اُسے دیکھنے کو نہ چاہے گا۔ سُنو، فاصلے کا تو مُجھے اندازہ نہیں، ہاں یہاں سے پُورب کی طرف دو مہینے کا راستہ ہے۔"

دونوں دوست پھر آپس میں پُرانی باتیں کرنے لگے۔ اُن باتوں کے دوران میں شنکر نے مایا نگر کا راستہ دو تین بار دریافت کیا۔ بڑے بڑے مقامات کے نام لکھ لیے۔ اُس نے جی میں ٹھان لی تھی کہ منوہر کے رُخصت ہونے کے بعد مایا نگر کی راہ لوں گا اور اپنی آنکھوں سے دیکھوں گا کہ جو دُنیا میں نے اپنے وہم یا خواب کی حالت میں دیکھی ہے، اُس کا کوئی وجود بھی ہے یا نہیں۔ منوہر دو دِن اُس کے ہاں ٹھہرا اور تیسرے روز رُخصت ہو گیا۔ اُس سے اگلے دِن شنکر بھی گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ گھر والوں سے اُس نے کہہ دیا تھا کہ چھ سات مہینے بعد واپس آؤں گا۔ چونکہ پہلے بھی وہ کئی بار باہر جاتا رہا تھا، اِس لیے کسی نے کُچھ خیال نہ کیا۔

شنکر نے گھر سے نکلتے ہی پُورب کا راستہ لیا۔ سات روز تو ایسی جگہوں سے گُزرا جہاں سے پہلے بھی اُس کا گُزر ہوا تھا۔ آٹھویں روز ایک ایسے جنگل میں داخل ہوا جو اُس کا دیکھا بھالا نہ تھا۔ اتّفاق سے ایک ساتھی مل گیا۔ دونوں ہنستے بولتے سات روز بعد جنگل سے باہر نکلے۔ اِس کے بعد اُس شخص نے تو اپنی راہ لی اور شنکر پُورب کی طرف مُنہ کیے چلتا رہا۔

تین چار روز وہ ایسے مقامات سے گُزرا جنہیں وہ بالکل نہیں جانتا تھا، لیکن چوتھے روز اُسے بڑی حیرانی ہوئی۔ وہ اُسی گاؤں میں جا پہنچا جہاں اُس نے چنگڑوں کے ساتھ کُچھ دِن گزارے تھے۔ اُس جگہ کا چپّا چپّا اُس کا جانا پہچانا تھا۔ اُس درخت پر چڑھ کر میں جامن توڑا کرتا تھا۔ اِس نالے کے کنارے میرا قبیلہ ایک بار مہینہ بھر سے زیادہ ٹھہرا تھا۔ اُس نے ایسے آدمی بھی دیکھے جن کی شکل صورت جانی پہچانی لگتی تھی۔ ہاں عُمر کا فرق ضرور پڑ گیا تھا۔ جنہیں بچّہ دیکھا تھا، اب وہ اُدھیڑ عُمر کے تھے اور جنہیں جوان دیکھا، وہ اب بُوڑھے ہو گئے تھے۔ پھر بھی بہت سی صورتیں صاف پہچانی جاتی تھیں اور بہت سوں کے نام بھی اُسے معلوم تھے۔ وہ اُن سے شنکر چنڈال اور اُس کے قبیلے کے بارے میں پوچھنا چاہتا تھا، مگر ہمّت نہ ہوئی۔

رات کو اُس نے اُسی گاؤں میں قیام کیا اور اگلے روز جہاں جہاں سے گُزرا، وہ تمام مقامات اُس کے جانے پہچانے معلوم ہوئے۔ کئی روز اِسی طرح چلتا رہا۔ آخر اُسے وہ بستی ملی جہاں اُس کی شادی چنڈی سے ہوئی تھی۔ شنکر نے بستی کے باہر وہ

جگہ بھی دیکھی جہاں دعوت اور دعوت کے ساتھ جو تُم پیزار ہوئی تھی۔ بستی کے اکثر لوگوں اور اُن کے ناموں سے وہ واقف تھا۔ بزاز کی دُکان جہاں سے کپڑا خریدا تھا اور درزی کی دُکان جہاں سے اُسے سِلوایا تھا، اُسی طرح موجود تھیں، لیکن دُکان دار بُوڑھے ہو گئے تھے۔ چلتے چلتے وہ دُکان نظر آئی جہاں شنکر کی ماں نے لوٹا چرایا تھا۔ بُوڑھا دکان دار بیٹھا تھا۔ شنکر سلام کر کے پاس بیٹھ گیا۔ اُس نے مہمان سمجھ کر اپنے ہاں ٹھہرنے کی دعوت دی اور شنکر نے دعوت قبول کر لی۔ باتوں باتوں میں شنکر نے اُس سے پوچھا۔ ”یہاں چنڈالوں کا ایک قبیلہ آیا تھا، اور اُس میں ایک نوجوان چنڈال شنکر بھی تھا۔ آپ کو اُن لوگوں کا حال کُچھ معلوم ہے؟“

بُوڑھا دُکاندار مُسکرایا اور کہنے لگا۔ ”بڑی پرانی بات پوچھی ہے آپ نے۔ وہ لوگ یہاں آیا کرتے تھے اور کیا بتاؤں، بڑے ہی بد معاش تھے۔ شنکر کی ماں میرا لوٹا چرا لے گئی اور اُس چڑیل کے بیٹے نے اُلٹا دو روپے جرمانہ مُجھ پر کرا دیا۔ جگ ہنسائی ہوئی، وہ الگ۔ اب تک میرے دوست مُجھ پر ہنسا کرتے ہیں۔ شاید کسی نے

آپ کو بھی یہ قصّہ سُنایا ہو گا۔ لیکن انہیں قُدرت کی طرف سے سزا بھی خوب ملی۔ یہاں سے دو روز کی راہ پر ایک بستی ہے، وہاں جا کر سب مر گئے۔ اب ہم لوگ چین سے رہتے ہیں۔ چوری چکاری کا پہلا سا ڈر نہیں رہا۔"

شنکر بُوڑھے کی باتیں سُن کر ہنستا رہا۔ رات اُس نے وہاں گزاری اور صُبح اپنا راستہ لیا۔ تیسرے روز وہ اُس گاؤں میں پہنچا جہاں اس کے کئی رشتے دار بیماری سے مرے تھے۔ یہاں سے وہ جنگل میں داخل ہوا اور کئی ہفتوں بعد اُس میدان میں پہنچا جہاں ہاتھی نے اُسے راجا بنایا تھا۔ وہ بڑے دروازے سے شہر میں داخل ہوا۔ تمام بازار اور گلی کوچوں سے واقف تھا۔ یہ فلاں امیر کی حویلی ہے۔ یہ فلاں وزیر کا مکان ہے۔ یہ وزیرِ اعظم کا محل ہے۔ یہ فلاں بازار ہے، یہ فلاں محلّہ ہے۔ تمام مکان مال اسباب سے بھرے پڑے تھے لیکن آدمی کا کہیں نام نشان نہ تھا۔ چلتے چلتے وہ اپنے محل میں پہنچا۔ ایک ایک کمرا اُس کا جانا پہچانا تھا۔ وہ عیش و آرام جو اُسے یہاں میسّر آیا تھا، اُس کی نگاہوں میں پھرنے لگا۔

محل سے نکل کر وہ اُس تالاب کی طرف آیا۔ تالاب کے پاس چند آدمی کھڑے تھے۔ اُن میں سے بعض آس پاس کی بستیوں کے نمبر دار تھے۔ شنکر اُنہیں دیکھتے ہی پہچان گیا۔ اُس کو حیران دیکھ کر ایک آدمی کہنے لگا۔

"یہاں جو بھی آتا ہے حیران رہ جاتا ہے۔ آپ سے پہلے چار پانچ مہینے ہوئے منوہر نام کا ایک نوجوان یہاں تھا۔ وہ بھی اِسی طرح حیران ہو گیا تھا۔"

شنکر کو یہ سُن کر اور بھی حیرانی ہوئی۔ پھر اُنہوں نے اسے بتایا کہ یہاں دس برس تک ایک چنڈال حکومت کرتا رہا اور سب لوگ اُس نیچ ذات کے ساتھ کھاتے پیتے رہے۔ جب لوگوں کو اُس کا حال معلوم ہوا تو وہ اپنا مذہب خراب ہونے کے دُکھ سے آگ میں جل کر مر گئے۔ ایک شخص بولا کہ اُن میں میرا باپ بھی تھا، دوسرا کہنے لگا کہ میرے دو بڑے بھائی بھی اُن مرنے والوں میں تھے۔ اِس طرح وہ سارے شکایت کرتے تھے اور شنکر چنڈال کو گالیاں دیتے تھے۔

شنکر نے اُن سے پوچھا۔ "کیا تُم میں کسی نے اُس چنڈال کو دیکھا بھی تھا؟"

ایک آدمی کہنے لگا۔ ”دیکھا کیوں نہیں تھا۔ سب نے دیکھا۔ آپ کا رنگ تو گندمی، قد چھوٹا اور بدن چھریرا ہے، لیکن وہ لمبا اور مضبوط قد کاٹھ کا تھا۔ عُمر ساٹھ برس سے اوپر تھی اور رنگ توے کی طرح سیاہ تھا۔“

رات شنکر نے نمبر دار کے گاؤں میں گزاری اور صُبح ہوتے ہی واپس گھر کا رُخ کیا۔ وہ انھی جگہوں سے ہوتا ہوا ڈھائی مہینے بعد گھر پہنچا۔ آنے جانے میں اُسے پانچ مہینے لگے تھے۔ اُس نے گھر والوں کو یہ قصّہ سُنایا تو کسی کو یقین نہ آیا۔ گھر والوں سے یہ بات دُوسرے لوگوں تک پہنچی اور وہ بھی شنکر کی عجیب و غریب کہانی سُننے کے لیے اُس کے پاس آنے لگے۔ کہانی سُن کر مزا تو ہر کوئی لیتا تھا لیکن اس کے سچّے ہونے کا یقین کسی کو نہ آتا تھا۔ اس کا دوست منوہر بھی، جس نے مایا نگر کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا، اب وہاں نہیں تھا۔ وہ پرس پُور یا کشمیر کی طرف نکل گیا تھا۔

لوگ شاید اُس کی باتوں کو سچ جان لیتے لیکن ہُوا یہ کہ جب کُچھ من چلے لوگوں

نے پُورب کی طرف سفر کیا تو انہیں مایا نگر اور دو جگہیں کہیں دِکھائی نہ دیں جن کا ذکر شنکر نے کیا تھا۔ اِس سے لوگ یہ سمجھنے لگے کہ اُس کا دماغ چل گیا ہے۔ اُس کے ساتھ ہی اُنہوں نے اُسے مذاق کے طور پر شنکر چنڈال کہنا شروع کر دیا۔ لوگوں کا یہ مذاق اِس حد تک بڑھا کہ بہت سے لوگ اسے سچ مُچ چنڈال سمجھنے لگے اور اُونچی ذات کے کئی لوگ تو اِس بات پر مرنے مارنے کے لیے تیّار ہو گئے کہ وہ چنڈال ہو کر دیوتاؤں کی مُورتیاں کیوں بناتا ہے۔ شنکر سے لوگوں کا یہ سلوک برداشت نہ ہو سکا اور ایک شام وہ اِس دُنیا سے رُخصت ہو گیا۔ اُس کے سرہانے ایک کاغذ پڑا تھا جس پر لکھا تھا:

"دُنیا والوں نے مُجھے چنڈال کہہ کہہ کر میرا جینا دوبھر کر دیا ہے۔ تنگ آ کر میں اِس دُنیا کو چھوڑ رہا ہوں۔ لیکن میری یہ وصیّت ہے کہ چِتا کو اُس وقت تک آگ نہ دِکھائی جائے جب تک سارنگ بابا اور انوشا جی خود آ کر اِس کی اِجازت نہ دیں۔"

اور اب سارنگ بابا اور انوشا آ گئے تھے اور لوگ انتظار میں تھے کہ کب سارنگ

باباکی طرف سے شنکر کی چِتا کو آگ دِکھانے کی اجازت ملتی ہے۔لوگ شنکر کا ماجرا بیان کر چکے تو سارنگ بابا نے کہا:

”ہمیں شنکر کی کہانی سُن کر بالکل حیرانی نہیں ہوئی۔ ہمیں اِس سے پہلے شنکر کے بارے میں کُچھ علم نہ تھا اور ہم نہیں جانتے کہ اُس نے اپنی وصیّت میں ہمارا ذکر کیسے کیا ہے، یہ بات بھی حیرت کی ضرور ہے لیکن ہمیں اِس پر بھی حیرانی نہیں۔ ہم تقدیر کے ہاتھوں میں بے بس ہیں۔ ہم لاکھ اپنی مرضی کرنا چاہیں، ہوتا وہی کُچھ ہے جو تقدیر میں ہوتا ہے۔ شنکر پر جو کُچھ بیتی، وہ خواب بھی تھا اور حقیقت بھی۔۔۔ یہ دُنیا خواب اور حقیقت کے ایسے ہزاروں گورکھ دھندوں سے بھری ہوئی۔“

یہ کہتے ہوئے سارنگ بابا شنکر کی لاش کی طرف بڑھے۔اُس کا چہرہ کھول کر دیکھا اور پھر پلٹ کر لوگوں سے کہنے لگے۔ ”نہیں ہم اس کی چِتا کو آگ دکھانے کی اجازت نہیں دیں گے۔ یہ ایک بار آگ میں کود چکا ہے۔ ہم اِسے دوبارہ آگ

کے حوالے نہیں کریں گے۔ خاص کر اس حالت میں تو بالکل نہیں کریں گے۔ جب کہ اُس نے ہماری ایک امانت کو سنبھال رکھا ہے۔"

"امانت!" کئی لوگوں کی آوازیں ایک ساتھ آئیں۔ کیسی امانت؟"

"ابھی تمہیں معلوم ہو جائے گا۔" سارنگ بابا بولے۔ "انتظار کرو۔۔۔ جہاں تین دِن رات انتظار کیا ہے، وہاں تھوڑا سا انتظار اور کر لو۔"

اور پھر سارنگ بابا مُجھ سے کہنے لگے۔ "انوشا بیٹے، ذرا تُم بھی ایک نظر شنکر کے چہرے پر ڈال لو۔"

سارنگ بابا کے حکم پر میں نے شنکر کی لاش پر سے کپڑا ہٹایا تو ایک دم ایک بُو میرے نتھنوں سے ٹکرائی۔ یہ شنکر کی لاش کی بُو نہیں تھی بلکہ ایک ایسی بُو تھی جس سے میں پہلے ہی مانوس تھا۔۔۔ یہ وہ بُو تھی جو ایک عرصے تک دِن رات میرے ساتھ رہی تھی۔۔۔ یہ شانی کی بُو تھی۔ میرے دُودھ شریک بھائی شانی کی

بُو۔۔۔شنکر کی لاش سے شانی کی بُو آ رہی تھی!

میں حیرت سے اُچھل پڑا۔ ”باباجی! یہ تو۔۔۔۔۔“

”شش!“ سارنگ بابا نے مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ ”اِدھر آ کر اِس کے پیر تھام لو۔“ میں سر کی طرف سے ہٹ کر شنکر کے پیروں کی طرف آ گیا اور اُس کے پیر تھام لیے۔ سارنگ بابا اُس کے سر کی طرف جا کھڑے ہوئے۔ اور پھر سر جھکا کر آنکھیں بند کر کے مُنہ ہی مُنہ میں کُچھ پڑھا اور اِس کے ساتھ ہی شنکر کے چہرے پر زور پھونک ماری۔ پھُونک کے ساتھ ہی ایک پھنکار کی آواز آئی۔ سب لوگوں نے چونک کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ آس پاس کوئی سانپ نہ تھا۔ سارنگ بابا نے ایک بار پھر کُچھ پڑھ کر شنکر کے چہرے پھونکا۔ اِس کے ساتھ ہی پھر پھنکار کی آواز گونجی اور پھر ایک دم چِتا کی لکڑیوں میں آگ لگ گئی، شنکر کی لاش ہوا میں کوئی پندرہ ہاتھ اُوپر اُچھلی اور چِتا سے کوئی بارہ ہاتھ کے فاصلے پر جا گری۔ میں نے برابر لاش کے پاؤں تھام رکھے تھے اور کسی حالت میں بھی اُنہیں چھوڑا نہیں تھا۔

لوگوں کے لیے یہ سب کُچھ بڑا خوف ناک تھا مگر وہ اپنی جگہ بُت بنے کھڑے تھے۔ جب شنکر کی لاش دوبارہ زمین پر آئی تو سارنگ بابا مُجھ سے کہنے لگے: "اب اِس کے پاؤں چھوڑ دو اور مہا تالی چھیڑ و!"

میں نے بین سنبھالی اور مہا تالی کی دُھن چھیڑ دی۔ سارنگ بابا اُس کے سر کے پاس بیٹھ گئے اور میں اُس وقت تک بین بجاتا رہا جب تک چِتا کی تمام لکڑیاں جل کر راکھ نہیں ہو گئیں۔ اور پھر اچانک شنکر کا مُنہ ایک جھٹکے کے ساتھ کھُل گیا، اُس کے جسم میں حرکت ہوئی اور اُس کا سانس چلنے لگا۔

"ٹھہرو!" اچانک سارنگ بابا کی آواز آئی اور بین خود بخود میرے ہونٹوں سے الگ ہو گئی۔ میں حیرت سے شنکر کی طرف دیکھنے لگا جس کا مُنہ اب کسی اندھیرے غار کے بھیانک دروازے کی طرح کھلا تھا اور سانس کُچھ لوہار کی دھونکنی کی طرح چل رہی تھی۔

"اب شانی کی دُھن بجاؤ۔" سانگ بابا نے حُکم دیا۔ میں نے پھر بین سنبھالی اور

شانی کی دُھن چھیڑ دی۔ ایک مدّت کے بعد مجُھے یہ دُھن بجانے کا موقع ملا تھا۔ کُچھ دیر بعد کسی سانپ کا سر شنکر کے مُنہ سے باہر آیا۔ سارنگ بابا کا بایاں ہاتھ تیزی کے ساتھ بڑھا اور اُنہوں نے اس کی گردن دبوچ کر ایک دم باہر کھینچ لیا۔ میں نے فوراً اُسے پہچان لیا۔ وہ شانی تھا، میرا دُودھ شریک بھائی!

"شانی!" میں بڑے جوش سے پکارا۔

میری آواز سُنتے ہی شانی چونکا۔ سارنگ بابا نے اُسے چھوڑ دیا۔ میں اُس کی طرف لپکا اور وہ میری طرف اور پھر ہم ایک مدّت کے بچھڑے ہوئے بھائیوں کی طرح ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔ میں اُسے چُومتے ہوئے بار بار کہہ رہا تھا:

"شانی، تُم مجُھے چھوڑ کر کہاں چلے گئے تھے؟"

شانی میرے گلے سے لپٹتے ہوئے اپنی شُوں شُوں میں کہہ رہا تھا۔ "ابھی معلوم ہو جائے گا انوشا بھائی، ابھی سب کُچھ معلوم ہو جائے گا۔"

اُدھر تو میں اور شانی گلے مل رہے تھے، اِدھر سارنگ بابا نے پانی کی ایک بالٹی منگوائی اور شنکر پر اُنڈیل دی۔ پانی کا انڈیلنا تھا کہ قُدرت نے ایک مدّت کے بعد پھر وہی رنگ دِکھایا جو ہم اُس سے پہلے بانکے مُرلی والے راج کُماری چندرا اور بجرنگ نجُومی کے بیٹے کے معاملے میں دیکھ چکے تھے۔ وہ شنکر جیسے مرے ہوئے تین دِن ہو چکے تھے اور جسے لوگ جلانے کے لیے لائے تھے، جھر جھری لے کر یُوں اُٹھ بیٹھا جیسے ایک لمبی نیند کے بعد جاگا ہو۔

شنکر کو اُٹھتے دیکھ کر لوگوں کی چیخیں نکل گئیں، مگر یہ چیخیں ڈر کی نہیں حیرانی اور خوشی کی تھیں۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے کبھی میرے گلے میں جھولتے ہوئے شانی کی طرف دیکھتے تھے اور کبھی شنکر کی طرف۔ یہ اُن کے لیے ایک ایسا تماشا تھا جسے آنکھوں سے دیکھنے کے باوجود انہیں یقین نہیں آرہا تھا۔ مُردہ شنکر تین دِن بعد نہ صرف دوبارہ زندہ ہو گیا تھا بلکہ اُس کے جسم سے ایک سانپ بھی نکلا تھا!

کنشک کے دربار میں

شانی کی واپسی کا معاملہ جلد ہی میری سمجھ میں آ گیا۔ شنکر نے چنڈال کی حیثیت سے جو زندگی گزاری تھی، اُس زندگی میں شانی اُس کی خوراک بن گیا تھا اور ایک مدّت تک اُس کے جسم کا حصّہ بنا رہا تھا۔ مُجھے شانی کے واپس مل جانے کی ایسی خوشی تھی کہ بیان نہیں کر سکتا۔ سارنگ بابا بھی مُجھے خوش دیکھ کر خوش ہو رہے تھے۔ شنکر کا دوبارہ زندہ ہونا اگرچہ ہمارے نزدیک ایک معمولی سی بات تھی، مگر لوگوں کے نزدیک یہ معمولی بات نہ تھی۔ یہ واقعہ ہوا کے پَر لگا کر اُڑا اور کہیں

سے کہیں پہنچ گیا۔ جس طرح کبھی سونے کے ہاتھی کے قصّے نے ہمیں پَرور پُور سے مہاراجا سیالکوٹ کے دربار میں پہنچا دیا تھا، اِسی طرح شنکر کے زندہ ہونے کی کہانی نے ہمیں کشان خاندان کے اُس راجا کے دربار میں پہنچا دیا جو دریائے سندھ کے پار پر ش پُور (پشاور) پر راج کر رہا تھا۔ اس راجا کا نام کنشک تھا۔

کشان قبیلہ کبھی شمال مغربی چین کے علاقے میں رہتا تھا۔ ہُن قبیلے کے حملوں نے اُن لوگوں کو وہاں نکلنے پر مجبور کر دیا۔ یہ لوگ صحرائے گوبی سے گزر کر باختر کے علاقے میں آئے اور ساکا قبیلوں کو شکست دے کر وہاں اپنی حکومت قائم کر لی۔ اُس قبیلے کی پانچ شاخیں تھیں مگر ایک دلیر اور حوصلہ مند کشان سردار کجل کدفیس نے تمام شاخوں کو ایک کر کے کشان سلطنت کی بنیاد رکھی اور ہندوکش کا پہاڑی عبور کر کے کابل کی وادی پر قبضہ کر لیا۔ ۳۸ سال حکومت کرنے کے بعد وہ ۸۰ سال کی عمر میں دُنیا سے رُخصت ہوا تو حکومت کی باگ ڈور اس کے بیٹے ویما کدفیس نے سنبھالی۔ اُس کے عہد میں کشان سلطنت مشرق میں کاشی اور جنوب میں نربدا تک پھیل گئی۔

پھر سلطنت کی باگ ڈور کشان خاندان کے تیسرے کنشک کے ہاتھ آئی۔ تخت نشین ہوتے ہی وہ راجدھانی کو پرش پُور لے آیا اور وہاں گوتم بُدھ کی یادگار کے طور پر لکڑی کا ایک خوبصورت مینار بنوایا جو کوئی سوا تین سو ہاتھ اونچا تھا اور جس کا نقشہ ایک یونانی معمار ایگی سالہ نے تیّار کیا تھا۔

اشوک نے تو بُدھ مت قبول کرنے کے بعد تلوار ہاتھ سے رکھ دی تھی لیکن کنشک نے دوسرے ملکوں کے خلاف لڑائیاں لڑنے کا سِلسِلہ جاری رکھا۔ اُس نے ٹیکسلا اور متھرا کے ساکا راجاؤں کی ریاستوں کو اپنی سلطنت میں شامل کیا، کشمیر کا علاقہ فتح کیا اور مالوہ اور گجرات پر اپنا جھنڈا لہرایا۔ اور تو اور وہ میناندر کی طرح پاٹلی پُتر تک بھی پہنچا مگر وہاں اُس کا مُقابلہ کرنے کے لیے کوئی پُشیا مِتر نہ تھا۔ وہاں کے آندھرا راجا نے نہ صرف کنشک کی اطاعت قبول کی بلکہ بُدھ مت کے ایک نامور عالم اشواگھوش کو تحفے کے طور پر کنشک کی خدمت میں پیش کیا۔ اشواگھوش اعلیٰ درجے کا شاعر، ڈرامہ نگار اور موسیقار تھا۔

سکندر اور اشوک کی طرح کنشک کو بھی شہر بسانے اور عمارتیں بنوانے کا شوق تھا۔ پریش پُور میں اُس نے لکڑی کے مینار کے علاوہ کئی خانقاہیں تعمیر کرائیں۔ کشمیر میں ایک مینار بنوانے کے علاوہ کنشک پور کے نام سے ایک شہر بسایا۔ ٹیکسلا میں بھی کئی محل اور عمارتیں بنوائیں اور جب اُس نے متھرا فتح کیا تو فتح کی یادگار کے طور پر اپنا ایک سُرخ پتھّر کا بُت بنوا کر نصب کروایا۔

کنشک کے عہد تک پہنچتے پہنچتے گوتم بُدھ کا سیدھا سادہ مذہب پیچیدہ ہو کر دو فرقوں میں تقسیم ہو گیا تھا۔ ایک فرقہ ہنسایان اور دوسرا مہایان کہلاتا تھا۔ ہنسایان فرقے والے بُدھ مت کے اصلی اصولوں میں کسی قسم کی تبدیلی کرنا جائز نہیں سمجھتے تھے۔ جب کہ مہایان فرقے والوں نے اپنے عقیدوں میں ایسی بہت سی باتیں شامل کر لی تھیں جن کا گوتم بُدھ کی اصل تعلیم میں کہیں ذکر بھی نہیں تھا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ مہایان فرقے نے پوجا پاٹ کے لیے گوتم بُدھ کی مورتیاں بنانا شروع کر دی تھیں اور اب جگہ جگہ بُدھ کے بُت بنائے اور پُوجے جا رہے تھے۔ اشوک ہنسایان فرقے اور کنشک مہایان فرقے سے تھا۔ اُس کی

سرپرستی میں گوتم بُدھ کے طرح طرح کے مجسّمے بن رہے تھے۔ وہ شِو جی، پاربتی، گنیش اور اِندر کے بُت بنایا کرتا تھا۔ اب دِن رات گوتم بُدھ کی مُورتیاں بنانے میں لگا ہوا تھا، اور اُسی کے تین دِن بعد زندہ ہونے کے واقعے نے ہمیں کنشک کے دربار میں پہنچایا تھا۔

جس طرح سے سیالکوٹ کے راجا کو اپنی بیٹی چمپا کے معاملے میں ایک مُشکل در پیش تھی، اِسی طرح کنشک اپنی بڑی رانی کے معاملے میں ایک ایسی مُشکل سے دو چار تھا، جسے اُس کے دربار کا کوئی شخص بھی حل نہیں کر پا رہا تھا۔ اشوا گھوش، واسو مِتر اور ناگ ارجن جیسے عالم اور چرک جیسے ماہر حکیم بھی عاجز تھے۔

اصل میں اِس مُشکل کا تعلّق چین کی لڑائی سے تھا۔ ویما کدفیس کے عہد میں چینی جرنیل پان چاؤ خُتن، کاشغر اور یار قند کے علاقوں کو فتح کرنے کے علاوہ کشان قبیلے کے کتنے ہی آدمیوں کو قیدی بنا کر لے گیا تھا۔ اُن قیدیوں میں ایک قیدی کنشک کی بڑی رانی کا بھائی تھا، جس کا نام دراشک تھا۔ کنشک نے راج گدّی پر

بیٹھتے ہی چین سے بدلہ لینے کا فیصلہ کیا۔ جب اُسے ٹیکسلا، متھرا، مالوہ، گجرات، کشمیر اور پاٹلی پُتر کی فتوحات سے فراغت ملی تو اُس نے ستّر ہزار سپاہیوں کا لشکر اپنے ساتھ لیا اور پامیر کی اُونچی گھاٹیوں کو عبور کرتا ہوا یار قند، کاشغر اور خُتن کے علاقوں پر ایک طوفان کی طرح ٹُوٹ پڑا۔ ایک سخت خوں ریز جنگ کے بعد اُس نے چین سے اپنے تمام علاقے واپس لے لیے۔ چین کے بادشاہ نے ایک چینی شہزادی کنشک کی نذر کی اور اُس کے ساتھ ہی ناشپاتی اور آڑو کے پھل بھی تحفے کے طور پر پیش کیے۔ پرش پُور سے پاٹلی پُتر تک اِن دونوں پھلوں کا اِس سے پہلے کوئی وجود نہ تھا۔ اِن تحفوں کے ساتھ ہی کنشک نے وہ قیدی بھی واپس لیے جنہیں چینی جرنیل پان چاؤ اپنے ساتھ لے گیا تھا مگر اُن میں دراشک شامل نہ تھا۔ قید کی حالت ہی میں وہ مر گیا تھا اور اُس کی لاش جلا دی گئی تھی۔ اُس کے ساتھی قیدیوں نے اُس کی ہڈّیوں اور راکھ کو ایک برتن میں سنبھال کر رکھ لیا تھا۔ کنشک جب چین کی مُہم سے واپس ہوا تو چینی شہزادی، ناشپاتی اور آڑو کے پھلوں کے علاوہ دراشک کی راکھ کا برتن بھی اُس کے ساتھ تھا۔

کنشک کی بڑی رانی جو اپنے بھائی کو زندہ سلامت دیکھنے کی آس لگائے بیٹھی تھی، اُس کی راکھ کو دیکھ کر دھاڑیں مار مار کر روئی۔ اِس بات کو کئی برس ہو گئے تھے مگر اِن کئی برسوں میں ایک دِن بھی ایسا نہ تھا جس دِن اُس نے اپنے بھائی کی یاد میں آنسو نہ بہائے ہوں۔ اب جو اُس نے شنکر کے جی اُٹھنے کی بات سُنی تو پہلے شنکر کو اور پھر سارنگ بابا اور انوشا کو بُلوا بھیجا۔

راجا کنشک اور اُس کی بڑی رانی نے ہماری بڑی آؤ بھگت کی اور پھر وہ برتن ہمارے سامنے رکھ دیا جس میں دراشک کی راکھ تھی۔ اِس کے ساتھ ہی رانی نے سارنگ بابا کے قدم چھوئے اور پھر دونوں ہاتھ جوڑ کر کہنے لگی:

”آپ بڑی کرنی والے ہیں۔ میں دُکھیا اپنے بھائی کو ملنے کے لیے تڑپ رہی ہُوں۔ بچھڑے بھائی کو بہن سے ملانا اب آپ کا کام ہے۔“

سارنگ بابا نے برتن کا ڈھکنا اُٹھا کر اُس کے اندر پڑی ہوئی ہڈّیوں اور راکھ کو پہلے دیکھا اور پھر بولے۔ وہ ناشپاتیاں اور آڑو کہاں میں جو مہاراج چین سے اپنے ساتھ

لائے تھے؟"

رانی نے جواب دیا۔ "وہ پھل تو ہم لوگوں نے کھا لیے تھے اور اُن کے بیج مالیوں نے باغ میں لگا دیے تھے۔ اُن بیجوں سے اُگے ہوئے کئی درخت اب پھل دے رہے ہیں۔"

"خُوب! خُوب!" سارنگ بابا نے کہا۔ "ایسا معلوم ہوتا ہے کہ چین نے اِن تحفوں کو یہاں کی مٹّی راس آئی ہے۔ اور وہ چینی شہزادی کہاں ہے جو اِن تحفوں کے ساتھ آئی تھی؟"

"وہ راج محل ہی میں ہے۔" رانی نے جواب دیا۔ "ویسے تو وہ میری باندیوں میں شامل ہے، لیکن اُسے نہ باندی سمجھتی ہوں اور نہ باندیوں کی طرح رکھتی ہوں۔ میں نے اُس کے ساتھ بالکل ایک بہن کا سا میں برتاؤ کیا ہے۔"

"اچھّی بات ہے! اچھّی بات ہے!" سارنگ بابا بولے "ذرا اپنی اُس چینی شہزادی

کو بُلواؤ۔ ہم اُس سے کُچھ باتیں کرنا چاہتے ہیں۔" بڑی رانی نے ایک باندی کو بھیج کر چینی شہزادی کو بُلوا لیا۔

"تمہارا نام کیا ہے، بیٹی؟" سارنگ بابا نے پُوچھا۔

"تُووائی۔"

"تُم بہت اچھّی لڑکی ہو۔ بڑی رانی تُم سے بہت خوش ہیں اور کہتی ہیں کہ میں تُووائی کو اپنی بہن کی طرح سمجھتی ہوں۔"

"یہ رانی جی کی مہربانی ہے۔" تُووائی نے کہا۔ "ورنہ میں تو اِن کی باندی ہوں۔"

"اچھّا تُووائی، ایک بات بتاؤ۔ رانی تمہیں اپنی بہن سمجھتی ہیں، کیا تُم اِن کا بھائی بننا پسند کرو گی؟"

"میں آپ کی بات نہیں سمجھی بابا جی۔"

”یہ بات تمہارے سمجھنے کی ہے بھی نہیں۔“ سارنگ بابا بولے۔ ”اگر تُم دراشک کے روپ میں آجاؤ تو کیسا رہے گا؟“

”یہ تو بہت ہی پیاری بات ہو گی۔“ بڑی رانی نے کہا۔ ”لیکن ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟“

”ہو سکتا ہے۔“ سارنگ بابا بولے۔ ”اور ابھی تمہاری آنکھوں کے سامنے ہو سکتا ہے۔ سُنو تُووائی! اگر تمہیں یہ منظور ہے تو باغ سے ناشپاتیاں اور آڑو توڑ لاؤ۔ اِس کے ساتھ ہی ہر درخت کی ایک ایک ٹہنی بھی توڑ لانا۔“

تُووائی نے کُچھ دیر بعد ہی ناشپاتیوں اور آڑوؤں کی کئی ٹوکریاں ہمارے سامنے لا رکھیں اور ساتھ ہی اِن درختوں کی ٹہنیوں کا ڈھیر لگا دیا۔ سارنگ بابا بُہت خُوش ہوئے، اور بولے۔

”تُم نے اپنے کام میں بڑی پھُرتی دِکھائی ہے۔ شاباش! اب اِدھر آؤ اور ذرا میرا

ہاتھ بٹاؤ۔“

سارنگ بابا نے تُووائی کی مدد سے ناشپاتی اور آڑو کی ٹہنیاں آڑی آڑی رکھ کر اُن کا آدمی کے قد کے برابر کوئی ساڑھے تین ہاتھ لمبا ایک بستر سا بنایا اور پھر دراشک کی راکھ اور ہڈّیاں ڈال دیں۔ راکھ اور ہڈّیوں کو اُنہوں نے ناشپاتیوں اور آڑوؤں سے ڈھانپ دیا اور پھر ایک زرد چادر منگوا کر اُن کے اوپر ڈال دی۔ چادر ڈالنے کے بعد یُوں معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی آدمی ٹہنیوں اور پتّوں کے بستر پر لیٹا ہوا ہے۔ پھر سارنگ بابا تُووائی سے کہنے لگے: ”لو تُووائی! اب تُم آہستہ سے اِس چادر کے اوپر لیٹ جاؤ۔“

تُووائی خاموشی سے ایک فرماں بردار بچّی کی طرح چادر پر لیٹ گئی اور سارنگ بابا نے سُرخ رنگ کی ایک چادر منگوا کر اُس کے اوپر ڈال دی۔

میں ایک کونے میں خاموش کھڑا یہ تماشا دیکھ رہا تھا اور اپنے گلے میں جھولتے ہوئے شانی سے کھیل رہا تھا۔ اب سارنگ بابا نے مُجھے آواز دی۔ ”ادھر آؤ انوشا

بیٹے، اب تمہارا کام شروع ہوتا ہے۔“

یہ کہتے ہوئے اُنہوں نے شانی کو اپنے ہاتھ میں لیا اور پھر اُسے زرد چادر کے ایک کونے کے نیچے چھُپا کر بیٹھ گئے۔ اِس کے ساتھ ہی اُنہوں نے مجُھے شانی کی دُھن بجانے کا اشارہ کیا۔

میں نے بِین مُنہ سے لگاتے ہوئے شانی کی دُھن چھیڑ دی اور سارنگ بابا اپنے گرو ناگیسن کے منتر کا جاپ کرنے لگے۔ پھر جیسے ہی شانی کی پھنکار کی آواز آئی، اُنہوں نے بِین بند کرنے کا اشارہ کیا اور ساتھ ہی شانی کو چادر سے باہر کھینچ لیا۔ پھر انہوں نے سُرخ چادر کا سِرا اُٹھایا اور شانی سے بولے:

”شانی! اب تُم بھی خاموشی سے تُووائی کے پاس لیٹ جاؤ۔“

اور یہ کہتے ہوئے اُنہوں نے شانی کو تُووائی کے پاس لِٹا کر سُرخ چادر پھر سے برابر کر دی۔ اِس کے بعد وہ مُجھ سے مخاطب ہوئے۔ ”ہاں انوشا بیٹے! اب مہا تالی

چھیڑو۔"

اور میں نے بِین پر مہا تالی کی دُھن چھیڑ دی۔ شانی کی پھنکار کے بعد زرد چادر کے نیچے سے دھواں سا نکلنے لگا تھا۔ میں نے مہا تالی چھیڑی تو دھواں نکلنے کی رفتار اور تیز ہو گئی۔ فضا ناشپاتیوں اور آڑوؤں کے پھلوں، پتّوں اور ٹہنیوں کے جلنے کی بُو سے بوجھل ہو گئی، مگر زرد اور سُرخ رنگ کی چادروں پر اِس کا کُچھ اثر نہیں ہوا۔ میں اُس وقت تک بِین بجاتا رہا جب تک زرد چادر کے نیچے سے دھواں نکلنا بند نہیں ہو گیا۔

میں نے مہا تالی کی دُھن چھیڑی تو شام ہو رہی تھی اور جب سارنگ بابا کے اشارے پر بِین اپنے ہونٹوں سے ہٹائی تو صُبح کا اُجالا پھیل رہا تھا۔ ساری رات مُجھے بِین بجاتے گُزر گئی تھی۔ ساری رات سارنگ بابا چادروں کے پاس بیٹھے کوئی منتر پڑھتے رہے تھے، اور ساری رات کنشک اور اُس کی بڑی رانی، اپنی باندیوں کے ساتھ قریب کھڑی اُمّید بھری نگاہوں سے زرد اور سُرخ چادروں کی طرف

دیکھتے رہے تھے۔

جب چادروں کے نیچے سے دھواں نکلنا بالکل بند ہو گیا تو سارنگ بابا اُٹھے اور ایک جھٹکے کے ساتھ سُرخ چادر کھینچ کر ایک طرف پھینک دی۔ اُس کے نیچے زرد چادر کے اوپر نہ تُو وائی تھی اور نہ شانی۔ صرف کُچھ راکھ پڑی تھی۔ سارنگ بابا نے اِس راکھ کو احتیاط سے جمع کیا اور پھر سُرخ چادر کی طرح زرد چادر بھی کھینچ کر ایک طرف ڈال دی۔

نیچے راکھ کا ایک ڈھیر تھا۔ سارنگ بابا نے پانی کی ایک بالٹی منگوائی اور اُس میں وہ راکھ گھولی جو زرد چادر کے اوپر سے اکٹھی کی تھی اور پھر اُس پانی کر راکھ کے ڈھیر پر اُنڈیل دیا۔ پانی کا اُنڈیلنا تھا کہ راکھ کے اندر سے ایک نوجوان ایک دم اُچھل کر کھڑا ہو گیا۔ یہ دراشک تھا!

بڑی رانی نے حیرانی سے اُس کی طرف دیکھا اور خوشی سے "بھیّا!" کہہ کر اُس سے لپٹ گئی۔ اُس کا بھائی ایک مدّت کے بعد دوبارہ زندہ ہو تھا۔ سارنگ بابا اب راجا

کنشک سے مُخاطب ہوئے:

”لو مہاراج، ہم نے تمہاری بڑی رانی کی مُشکل آسان کر دی ہے۔ برسوں پہلے ہم نے بھوگ متی کے راجا ناگ سین کے بیٹے کو زندہ کرنے کے لیے اُوشا بیٹی اور اُس کے پالتو سانپ امبر کی قربانی دی تھی، اور اب تمہاری بڑی رانی کی خوشی کی خاطر ہم نے اُس شانی کو قربان کر دیا ہے جو ہمارا بیٹا اور انوشا کا دُودھ شریک بھائی تھا۔“

”آپ کا یہ احسان کبھی نہیں بھولیں گے۔“ راجا کنشک بولا۔

بڑی رانی دراشک کو ساتھ لیے آگے بڑھی اور سارنگ بابا کے پیر چھُوتے ہوئے بولی۔ ”ہم دونوں بہن بھائی زندگی بھر آپ کی اِس بھلائی کو یاد رکھیں گے۔“

”اس کے ساتھ یہ بھی یاد رکھنا کہ تُووائی نے اس کے لیے اپنے آپ کو قربان کر دیا ہے۔“

"میں یادرکھوں گی، برابر یادرکھوں گئی۔" بڑی رانی نے کہا۔ اُس کی آنکھوں میں خُوشی کے آنسو تیر رہے تھے۔

آنسو میری آنکھوں میں بھی تیر رہے تھے، لیکن یہ آنسو اُس شانی کے لیے تھے جو مدّت کی جُدائی کے بعد اب دوبارہ مُجھ سے ملا تھا اور اب ہمیشہ کے لیے بچھڑ گیا تھا۔

مگر راجا کنشک، اس کی بڑی رانی اور بڑی رانی کے دوبارہ زندہ ہونے والے بھائی دراشک کی خوشیوں کی خاطر میں نے اپنے آنسو پی لیے۔ یوں بھی مُجھے خوشی کے اِس رنگ میں بھنگ ڈالنے کا کوئی حق نہ تھا۔

دراشک کے زندہ ہونے کی خوشی میں کنشک نے ایک بھاری جشن منایا اور اس کے اصرار پر ہم اس جشن میں شامل ہوئے، مگر میرا دِل شانی سے بچھڑنے کی وجہ سے اُداسی کی زبردست لپیٹ میں تھا، اس لیے اِس جشن سے فارغ ہوتے ہی ہم خاموشی سے اُس پرش پُور سے نکل گئے جس نے میرا دُودھ شریک بھائی شانی

مُجھ سے چھین لیا تھا۔

اشوک کی طرح کنشک نے بھی بُدھ مت کے پانچ سو سے زیادہ عالموں کی مجلس بُلائی تھی۔ اس مجلس کی صدارت اُس اشواگھوش نے کی تھی جو اُسے پاٹلی پُتر سے تحفے کے طور پر ملا تھا۔ مگر بُدھ مت کا اس طرح دم بھرنے کے باوجود کنشک نے اشوک کی طرح تلوار ہاتھ سے نہیں رکھی تھی۔ وہ برابر لڑائیوں میں اُلجھا رہتا تھا۔ اس کے امیر، وزیر، درباری اور سپاہی اِن روز روز کی جنگوں سے اتنے تنگ آ گئے تھے کہ ایک بار جب وہ بیمار ہوا تو اُنہوں نے اُس پر ایک رضائی ڈال دی اور خود اس پر چڑھ کر بیٹھ گئے۔ کنشک دم گھُٹ جانے سے مر گیا۔

کنشک کے بعد اُس کی سلطنت کا وہی حال ہوا جو اشوک کے بعد موریہ سلطنت کا ہوا تھا۔ کنشک کے بعد اس کا بیٹا ہوشک تخت پر بیٹھا۔ کنشک کی طرح اُس نے بھی ایک شہر ہوشک پُور کے نام سے بسایا اور متھرا میں گوتم بُدھ کے نام پر ایک خانقاہ تعمیر کرائی۔ اس کے بعد واسدیو نے تخت سنبھالا اور پھر کشان سلطنت کئی

چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تقسیم ہو گئی۔ مگر سارنگ بابا اور میں کشان سلطنت کے اِن بکھیڑوں سے دُور ناگ راجاؤں کی راجدھانی ناگپُور پہنچ چکے تھے۔

نرنجن ناگ سے مُقابلہ

پاٹلی پُتر کے شیش ناگ راجاؤں کی طرح ناگپُور کے ناگا راجاؤں کی بھی ایک تاریخ تھی۔ وہ باسک ناگ کی اولاد تھے اور کسی زمانے میں ودیسا (گوالیار) پر راج کرتے تھے۔ ساکا اور کشان قوموں کے حملوں نے اُنہیں وہاں سے نکلنے پر مجبور کر دیا تو وہ جنوب کی طرف چلے اور وندھیاچل کے پہاڑوں کے پار پہنچ گئے۔ وہاں اُنہوں نے ناگ پُور کا شہر بسایا اور کوئی دو سو سال تک امن چین سے راج کرتے رہے۔

امن چین سے رہنے بسنے کے باوجود وہ اپنی فوجی طاقت برابر بڑھاتے رہے تھے اور موقع کے انتظار میں تھے۔ یہ موقع قُدرت نے اُنہیں کنشک کے مرنے کے بعد دے دیا۔ جب کشان سلطنت کمزور ہونے لگی تو نواناگ نام کا ایک راجا فوج لے کر وندھیاچل کی پہاڑیوں سے اُترا اور کشان سلطنت کے علاقوں پر طوفان بن کر ٹوٹ پڑا۔ پورے تیس سال تک وہ کشان راجاؤں کے خلاف لڑتا رہا۔ اُس کے مرنے کے بعد اس کے بیٹے ویر سین نے بھی یہ لڑائی جاری رکھی۔ اس نے اور بہت سے راجاؤں کو اپنے ساتھ ملا لیا اور اس طرح گنگا کی وادی، متھرا، بند ھیل کھنڈ اور بگھیل کھنڈ کے علاقوں سے کشان حکومت کا خاتمہ کر دیا۔ اپنے باپ نوناگ کی طرح اُس نے بھی اپنی حکومت کے چالیس سال کشان سلطنت سے جنگ کرتے ہوئے گزارے۔

پھر ہوتے ہوتے ناگ راجاؤں کی یہ راج گدّی بھاوا ناگ کے حصّے میں آئی اور وہ بھی اپنے باپ دادا کی طرح ساری زندگی کشان سلطنت سے لڑتا رہا۔ اس کا لڑکا کوئی نہ تھا، صرف ایک لڑکی تھی جس کی شادی پڑوسی وکاتک ریاست کے راجا

پرادر سین کے بیٹے گوتمی پُتر سے ہوئی تھی۔ بھاوناگ کے مرنے کے بعد ناگا ریاست گوتمی پُتر اور ناگاراج کُماری کے بیٹے رودر سین کو ملی اور اِس طرح ناگا اور وکاتک دونوں سلطنتیں ایک ہی سلطنت بن گئیں۔

ناگا اور وکاتک راجاؤں کے جنگی دباؤ کے باعث گنگا کی وادی سے ہی نہیں، سات دریاؤں کی سر زمین کے بڑے حصّے سے کشان حکومت کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ مگر اس دوران میں وندھیاچل کے پار مگدھ، ایودھیا اور اُس کے آس پاس کے علاقوں میں ایک اور خاندان اپنی طاقت آہستہ آہستہ بڑھا رہا تھا۔ یہ گُپت خاندان تھا، جس کی بنیاد چندر گُپت نام کے ایک راجا نے رکھی تھی۔

یہ خاندان اصل میں سات دریاؤں کی دھرتی کا رہنے والا تھا۔ اس خاندان کے لوگ ساکا راجاؤں کی ملازمت کرتے ہوئے مگدھ اور ایودھیا پہنچ گئے تھے اور پھر جاگیریں مل جانے پر وہیں بس گئے تھے۔ جب ناگاؤں نے ساکا راجاؤں سے راج گدّی چھین لی تو اُن لوگوں کے پاس جاگیریں پہلے کی طرح رہنے دیں۔ اس

خاندان کے ایک نوجوان چندر گُپت کی شادی جنگجو قبیلے لچھاوی کی ایک لڑکی کمارا دیوی سے ہوئی تھی۔ اپنے سُسرال کی حمایت سے چندر گُپت نے پاٹلی پُتر پر قبضہ کر لیا اور مگدھ کے راجا سُندر ورمن کو راج گدّی سے اُتار کر خود مگدھ کا راجا بن بیٹھا۔

پندرہ سال راج کرنے کے بعد چندر گُپت اِس دُنیا سے چل بسا تو اُس کا بیٹا سُمُدر گُپت راج گدّی پر بیٹھا۔ راج گدّی پر بیٹھتے ہی اس کی للچائی ہوئی نظریں اِرد گرد کے علاقوں پر پڑنے لگیں۔ جب تک پرادر سین جیتا رہا، تب تک تو وہ کُچھ نہ کر سکا۔ مگر پرادر سین کی آنکھیں بند ہوتے ہی اس نے ناگا راجاؤں کے علاقوں پر بھرپور حملہ کر دیا۔ رام نگر کے راجا اچیوتی، متھرا کے راجا گنپتی ناگ اور پدماوتی (گوالیار) کے راجا ناگ سین نے مل کر کوسمبھی کے قریب سُمُدر گُپت کا مُقابلہ کیا، مگر سُمُدر گُپت نے انہیں شکست دی اور متھرا، روہیل کھنڈ اور گوالیار کے علاقوں کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ اس کے بعد وکاتک راجا رودر سین اور سُمُدر گُپت میں صلح ہو گئی اور سُمُدر گُپت کے بیٹے چندر گُپت (جس نے بعد میں

بکرماجیت یاوکریادتیہ کالقب اختیار کیا) کی شادی ناردا اڑ (متھرا) کے راجا گنپتی کی بیٹی ستیہ وتی سے ہو گئی۔

مگر یہ صلح ایسی نہ تھی کہ سُمُدر گُپت کے ہاتھ باندھ دیتی۔ اُس نے وکاتک سلطنت کی طرف سے دھیان ہٹا کر اپنی فوجوں کا رُخ جنوب کے اُن راجاؤں کی طرف موڑ دیا جو وکاتک سلطنت کی وفاداری کا دم بھتے تھے۔ دو سال سے زیادہ عرصے تک وہ اس مُہم میں اُلجھا رہا۔ پھر جب کرشاندی سے واپس ہوا تو جنوب کے ایک نہ دو پورے گیارہ راجا اُس اطاعت کر چُکے تھے۔

اِس کے بعد اُس نے پُورب کی طرف رُخ کیا اور پاٹلی پُتر سے کامروپ (آسام) تک کے علاقے فتح کر لیے۔ اس طرح جمنا سے براہمہ پُتر اور ہمالیہ سے نربدا تک اُس کا جھنڈا لہرانے لگا۔

اِن فتوحات کی خوشی میں سُمُدر گُپت نے اشومیدھ یگیہ منانے کا فیصلہ کیا۔ گھوڑے کی قُربانی کا یہ جشن سُنگ خاندان کے بانی پُشیا مِتر نے بھی منایا تھا،

آندھرا کے سری ست کارنی نے بھی اور وکاتک خاندان کے پر اور سین نے بھی، مگر سُمُدر گُپت کی طرف سے منایا جانے والا جشن اِن سب سے مختلف تھا، اِس لیے کہ خُود سُمُدر گُپت اُن سب سے مختلف تھا۔

وہ تلوار کا دھنی ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اچھّا شاعر بھی تھا اور مختلف ساز خاص طور پر بِین بجانے کا بہت شوقین تھا۔ اس کے اسی شوق کا نتیجہ تھا کہ اس جشن کی رونق بڑھانے کے لیے ناچنے گانے والوں، بازی گروں، جادُوگروں اور نٹوں کی ٹولیوں اور شاعروں کے ساتھ ساتھ سپیروں اور جوگیوں کو بھی ڈھونڈ ڈھونڈ کر پاٹلی پُتر میں جمع کیا گیا۔ بالکل اُسی طرح جس طرح کہ کبھی سکندر نے سپیروں اور جوگیوں کو ٹیکسلا میں جمع کیا تھا۔ اِس لیے جب راجا گنپتی اِس جشن میں شامل ہونے کے لیے پاٹلی پُتر کی طرف روانہ ہوا تو اور لوگوں کے علاوہ سارنگ بابا اور میں بھی اُس کے ساتھ تھے۔۔۔ مگر ہمارا اِرادہ صرف تماشا دیکھنے ہی کا تھا۔

پاٹلی پُتر ہمارے لیے نیا نہ تھا، اور نہ جشن ہی ہمارے لیے نیا ہو سکتا تھا۔ ہم نے اُسی

شہر میں سُدھانند اور یو گانند کے جشن دیکھے تھے اور پھر پشیامتر کے اشومیدھ یگیہ کا جشن بھی دیکھا تھا۔ اُن سے بھی بہت پہلے ہم نے راجا پورس، سکندر، چندر گُپت موریہ اور پھر سیلوکس کے دربار کے جشن دیکھے تھے۔ ہم اتنا کُچھ دیکھ چکے تھے کہ اب کوئی بات ہمارے لیے انوکھی نہیں تھی۔ مگر یہ بات میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھی کہ سُمُدر گُپت کے دربار میں میری آنکھیں ایک ایسا تماشا دیکھیں گی جو اپنی مثال آپ ہو گا!

اِس جشن میں شامل ہونے کے لیے دُور دُور سے سینکڑوں راجے آئے تھے اور سُمُدر گُپت نے اُن کے لیے عیش و آرام کے تمام سامان مہیّا کیے تھے۔ مقرّرہ وقت پر جشن کا آغاز ہوا۔ پنڈت مقدّس گھوڑے کو قُربان گاہ تک لائے اور پھر اُس گھوڑے کی قُربانی دی گئی۔ راج محل کے پُجاری نے گھوڑے کے خُون سے سُمُدر گُپت کے ماتھے پر تِلک لگایا۔

سُمُدر گُپت نے اِس موقع کے لیے سونے چاندی کے لاکھوں سِکّے لوگوں میں

بانٹنے کے لیے تیّار کرائے تھے۔ سِکّے نچھاور کرنے کے بعد سُمُدر گُپت مبارک سلامت کی گونج کے درمیان راج محل کے اُس دربار عام میں آیا جہاں ناچ گانے اور کھیل تماشے دِکھانے کا بندوبست کیا گیا تھا۔ یہاں بھی سب پہلے چند رسمیں ادا ہوئیں اور پھر سُمُدر گُپت کا درباری شاعر ہری سین آگے بڑھا اور سُمُدر گُپت کی شان میں ایک نظم پڑھی۔ ہری سین نظم پڑھ چُکا تو سُمُدر گُپت نے قیمتی ہیروں کی کئی مالائیں اُسے انعام میں دیں۔

اِس کے بعد کھیل تماشے شروع ہوئے۔ بازی گروں، نٹوں اور جادوگروں نے اپنے اپنے کرتب دکھائے درمیان میں مختلف شاعروں اور ناچنے والوں کی ٹولیاں بھی اپنے اپنے کمال دِکھاتی رہیں۔ دو دِن یہ سِلسِلہ جاری رہا۔ جشن کے تیسرے اور آخری دِن سپیروں اور جوگیوں کی باری آئی۔ سُمُدر گُپت خود بِین بجانے میں ماہر تھے اِس لیے ایک پورا دِن سپیروں اور جوگیوں کے لیے خاص کر دیا گیا تھا۔ رنجن ناگ، جس نے سُمُدر گُپت کو بِین بجانا سکھایا تھا، سُمُدر گُپت کے تخت کے پاس ایک اُونچی کرسی پر بیٹھا تھا۔

سپیروں اور جوگیوں نے اپنے اپنے کمال دِکھانے شروع کیے۔ بِین پر سانپ کا ناچ، سانپوں کی لڑائی، سپیرے کا ایک بھاری بھرکم سانپ کو اپنے بدن کے گرد لپیٹ کر قلابازیاں کھانا اور اِسی قسم کے دوسرے تماشے تھے جو صُبح سے شام تک جاری رہے۔

ہم راجا گنپتی اور اُس کے آدمیوں کے ساتھ بیٹھے تھے۔ جب سب جوگی اور سپیرے اپنے کمال دِکھا چکے تھے تو سُمُدرگُپت کے اُستاد رنجن ناگ نے بِین سنبھالی۔ اُس کے بِین بجانے ہی میں نے یُوں محسوس کیا جیسے میں ایک بار پھر پشکلاوتی میں ہوں۔ جتنی دیر رنجن بِین بجاتا رہا، میں یہی محسوس کرتا رہا جیسے میں شِیش ناگ کے مندر میں کھڑا ناگ پنچمی کے تہوار کے لیے سانپوں کو جمع کر رہا ہوں۔ میں تصوّر میں اپنے سامنے سینکڑوں سانپوں کو دودھ کی کٹوریوں سے دودھ دیکھ رہا تھا۔ مگر جب رنجن ناگ نے بِین ہونٹوں سے ہٹائی تو ایک جھٹکے کے ساتھ یہ طلِسم ٹُوٹ گیا۔ میں پشکلاوتی میں نہیں، پاٹلی پُتر میں تھا اور میرے سامنے ایک بھی سانپ نہیں تھا!

بے قرار سا ہو کر میں اپنی جگہ سے اُٹھا اور سُمُدر گُپت کے تخت کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ سُمُدر گُپت نے حیرانی سے میری طرف دیکھا اور کہا۔ ”کیا ہے لڑکے؟ تُم کون ہو اور کیا چاہتے ہو؟“

اِس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتا، سارنگ بابا میرے پاس آ کھڑے ہوئے اور سُمُدر گُپت کو سلام کرتے ہوئے بولے۔ ”یہ ہمارا بیٹا انوشا ہے، مہاراج۔ رنجن ناگ کی بِین سُن کر بے چین ہو گیا ہے اور اب خود بھی بِین بجانا چاہتا ہے۔ اجازت ہو تو یہ بھی اپنا شوق پورا کر لے۔“

سُمُدر گُپت نے اپنے اُستاد رنجن ناگ کی طرف دیکھا۔ اُس نے بے پروائی سے سر ہلاتے ہوئے اجازت دے دی۔ اِس پر سُمُدر گُپت نے کہا:

'تُم اپنا شوق پورا کر سکتے ہو، لڑکے یہ ہمارے گُرو کی مہربانی ہے کہ اُنھوں نے اِس کی اجازت دے دی ہے، ورنہ ہم تو اِن کے بعد کسی کی بِین سُننا گوارا نہیں کرتے۔“

میں نے بِین سنبھالی۔ سارنگ بابا آنکھوں ہی آنکھوں میں مُجھے کُچھ اِشارے کر کے واپس اپنی جگہ جا بیٹھے۔ میں نے پہلے چند ایک معمولی سی دُھنیں بجائیں اور پھر مہا تالی پہ آ گیا۔ ایک دم سپیروں اور جوگیوں کی پٹاریوں میں ہلچل مچ گئی۔ پھر پٹاریوں کے مُنہ کھُلے اور اُن کے اندر سے سانپ رینگتے ہوئے میرے پاس آ کر جھُومنے لگے۔ میں اپنی دُھن میں مست بِین بجا رہا تھا کہ رنجن ناگ تیزی سے اُٹھا اور بِین میرے ہاتھ سے جھپٹ لی۔ سپیرے اور جوگی اپنے اپنے سانپوں کو سنبھالنے کے جتن کرنے لگے۔ میں نے رنجن ناگ کی طرف دیکھا۔ اُس کی آنکھیں غصّے سے سُرخ ہو رہی تھیں۔

"تُم، تُم مہا تالی جانتے ہو! اِس کا مطلب یہ ہے کہ تم پہنچے ہوئے کھلاڑی ہو، اور اس کا مطلب یہ ہے کہ تُم وہ نہیں ہو جو دِکھائی دیتے ہو!" اور پھر وہ پلٹ کر سُمُدر گُپت سے کہنے لگا۔

"مجُھے یقین ہے کہ اِس لڑکے کی شکل میں ہماری آنکھیں ایک ایسے ناگ کو دیکھ

رہی ہیں جسے ایک خاص عُمر کو پہنچنے کے بعد یہ طاقت حاصل ہو جاتی ہے کہ جو شکل چاہے، اختیار کر لے۔ اِس سے پہلے کہ یہ ہمارے ہاتھ سے نکل جائے، اجازت ہو کہ ہم اِسے قابو میں کر لیں۔"

یہ کہہ کر رنجن ناگ نے میری کلائی پکڑ لی۔ عین اُسی وقت سارنگ بابا آگے آئے، اُنہوں نے ایک جھٹکے کے ساتھ میری کلائی رنجن ناگ سے چھڑا لی اور مُجھے سینے سے لگاتے ہوئے کہنے لگے:

"آپ کو غَلَط فہمی ہوئی ہے۔ انوشا میرا بیٹا ہے، ناگ نہیں ہے۔"

"نہیں، ہماری آنکھیں دھوکا نہیں کھا سکتیں۔" رنجن ناگ نے کہا۔ "یہ ضُرور کوئی ناگ ہے، ورنہ اِس عُمر کا لڑکا مہا تالی کی دُھن تو کیا اُس کا نام بھی نہیں جانتا۔"

سارنگ بابا نے کہا۔ "اسے مہا تالی میں نے سکھائی ہے۔ مہا تالی ہی نہیں، اور بہت کُچھ سکھایا ہے۔ یہ ناگ نہیں ہے۔ ہمارے اپنے دِل کا ٹکڑا ہے۔"

”نہیں، مُجھے پورا یقین ہے کہ یہ کوئی ناگ ہے اور میں اِسے قابو میں کر کے رہُوں گا۔“

سارنگ بابا نے سُمُدر گُپت کی طرف دیکھا اور کہا۔ ”مہاراج! آپ کیا کہتے ہیں؟“

سُمُدر گُپت نے جواب دیا۔ ”ہمارے گرو کی بات ہمارے لیے حکم کا درجہ رکھتی ہے۔ تُم اِس لڑکے کو اِن کے حوالے کر دو!“

اب سارنگ بابا دو قدم پیچھے ہٹ گئے اور بولے۔ ”اگر آپ کا حکم یہی ہے تو ٹھیک ہے رنجن ناگ انوشا کو ناگ سمجھتے ہیں تو اُسے قابو میں کرنے کی کوشش کر کے دیکھ لیں۔ لیکن اگر اِس کوشش میں رنجن ناگ کو کوئی نقصان پہنچا تو اُس کا دوش ہم پر نہیں ہو گا۔“

پھر وہ میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولے۔

”انوشا بیٹے! قُدرت کی اَن دیکھی طاقتوں نے تمہیں ایک عجیب امتحان میں ڈال

دیا ہے۔ آدمی کیا سوچتا ہے، اور کیا ہوتا ہے۔۔۔ تمہیں کیا کرنا ہے اور کیا نہیں، یہ تُم خود اچھّی طرح جانتے ہو۔۔۔ لو اب تُم جانو اور رنجن ناگ جائیں۔" یہ کہہ کر سارنگ بابا واپس اپنی جگہ پر جا بیٹھے۔ رنجن ناگ نے میرے ہاتھ سے بِین لے کر باہر پھینک دی اور پھر میرے اِرد گرد کوئلے سے ایک دائرہ لگا دیا۔ اِس دائرے سے باہر کھڑے ہو کر اُس نے بِین بجانی شروع کی۔ بِین کی دُھن وہی تھی جو کبھی ہم نے گائے کے تھنوں سے چمٹے ہوئے یوحا ناگ کو مست کرنے کے لیے بجائی تھی۔ وہی دُھن تھی جو ہم نے مہاراجا سیالکوٹ کے محل میں راج کُماری چمپا سے چمٹے ہوئے ناگ کو قابو میں کرنے کے لیے بجائی تھی۔۔۔ اور یہ وہی دُھن تھی جو کانگ مار کی ناگن کو اُس کے اصل روپ میں لانے کے لیے ہم نے بجائی تھی اور اب سُمُدر گُپت کا اُستاد رنجن ناگ وہی دُھن بجا کر مُجھے ناگ کی شکل میں لا کر قابو میں کرنے کی کوشش کر رہا تھا!

مگر میں یُوحا ناگ کہاں تھا کہ مُجھ پر اِس دُھن کا اثر ہوتا۔ اِس کے بجائے مُجھے اپنے اندر ایک آگ سی لگتی محسوس ہو رہی تھی۔ رنجن ناگ بِین بجا رہا تھا اور میں

اپنی جگہ خاموش کھڑا تھا۔ بیتے دِنوں کی تصویریں میری نظروں کے سامنے سے گُزر رہی تھیں۔۔۔ پشکلاوتی، ٹیکسلا، ویری ناگ، پَرور پور، کیسر ناگ، بھوگ متی، انومہ ندی، کپل وستو، ڈنڈک، مکنی ناتھ، دھولا گری، شیل شر نگن۔۔۔ اور شیل شر نگن کے ناگیسن مہاراج جِن کی خدمت میں سارنگ بابا نے ایک عُمر گزاری تھی۔ سب کُچھ میری نظروں کے سامنے سے گُزر رہا تھا۔

پھر جیسے کسی نے میرے کان میں چُپکے سے کہا:

"تمہیں کیا ہو گیا ہے انوشا! کیا تُم بھُول گئے ہو کہ تُم کون ہو اور سارنگ بابا نے تمہیں کیا سے کیا بنا دیا ہے؟ آگ، پانی، ہوا اور مٹّی تمہارا حکم مانتے ہیں۔۔۔ پھر تُم اِس طرح بے بس ہو کر کیوں کھڑے ہو؟"

میں حیران رہ گیا۔ یہ آواز میری ماں کی نہیں، میری خالہ کی تھی۔ ایک مدّت کے بعد میرے کانوں نے اُس کی آواز سُنی تھی۔ میں نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں اور اِدھر اُدھر دیکھا۔ وہاں کُچھ بھی نہ تھا۔ صرف رنجن ناگ تھا جو مجُھے مست

کرنے کی کوششوں میں برابر بِین بجائے جا رہا تھا۔ میں نے کُچھ کہنے کے لیے مُنہ کھولا۔

میں کہنا چاہتا تھا کہ آپ کیوں سے کار بِین بجا رہے ہیں۔ میں ناگ نہیں، آدمی کا بچّہ ہوں مگر ہوا یہ کہ میرے اندر اُس کی بِین سُن کر جو آگ سی لگی ہوئی تھی، میرا مُنہ کھلتے ہی وہ آگ ایک شُعلے کی صورت میں باہر نکلی اور اُس شعلے نے رنجن ناگ کے جسم کو اپنی لپیٹ میں لے لیا اور اُس کا سارا جسم سوکھی لکڑی کی طرح دھڑ دھڑ جلنے لگا۔ وہ بِین پھینک کر باہر کی طرف بھاگا لیکن میں نے آگے بڑھ کر اپنی پھونک سے اُس کے اِرد گرد آگ کا ایک حلقہ بنا دیا اور وہ اُس حلقے میں گھِر کر رہ گیا۔

یہ دیکھ کر سُمُدر گُپت تخت سے اُترا اور رنجن ناگ کی طرف بڑھا۔ اُس کے کئی اور درباری بھی بڑھے لیکن آگ کے حلقے کے باہر ہی رُک گئے۔ وہ آگ اُنہیں کوئی تکلیف نہیں دے رہی تھی اور نہ وہ اُس کی تپش محسوس کر رہے تھے، مگر وہ اُس

کے حلقے کے اندر قدم نہیں رکھ سکتے تھے۔

اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے آگ کا حلقہ غائب ہو گیا اور سارے دربار میں ایک دھواں سا پھیل گیا۔ سب کُچھ اُس دھویں میں چھُپ گیا۔ کُچھ دیر بعد جب دھویں کی یہ چادر ہٹی تو سُمُدرگُپت اور اس کے درباریوں نے دیکھا کہ رنجن ناگ اُن کے سامنے کھڑا ہے۔ مگر جاگتے انسان کی صورت میں نہیں، ایک بُت کی صورت میں۔۔۔۔ اور یہ بُت سر سے پیر تک سونے کا تھا!

سُمُدرگُپت اور اُس کے درباری حیران رہ گئے۔ خاصی دیر تک اُن کے مُنہ سے ایک لفظ تک نہ نکل سکا۔ پھر سُمُدرگُپت میری طرف مُڑا اور غصّے سے کہنے لگا:

”لڑکے! تُم کوئی سپیرے ہو یا جادُوگر! یہ تُم نے کیا کر دیا ہے؟“

اِس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتا، سارنگ بابا نے آگے بڑھ کر کہا۔ ”مہاراج جو کُچھ ہوا، اِس میں انوشا بیٹے کا کوئی قصور نہیں۔ یہ آگ تو رنجن ناگ کی اپنی لگائی

ہوئی تھی جس نے اُنہیں جلا دیا ہے۔۔۔ قُدرت نے اُنہیں آپ کی خاطر کندن بنا دیا ہے۔ وہ آپ کے اُستاد جو تھے۔"

"ہاں، وہ ہمارے گُرو تھے۔" سُمُدر گُپت نے کہا۔ "مگر آج میدان تمہارے ہاتھ رہا ہے۔ اب تُم ہمارے گرو ہو!"

یہ کہہ کر سُمُدر گُپت نے آگے بڑھ کر میرا اور سارنگ بابا کا ہاتھ تھام لیا اور کہنے لگا۔ "رنجن ناگ صرف بِین بجانا جانتے تھے لیکن ہم جان گئے ہیں کہ تُم دونوں بِین بجانے کے علاوہ اور بھی بہت کُچھ جانتے ہو۔ آج سے تُم ہمارے دربار میں رہو گے۔ ہمارے درباری بن کر نہیں، ہمارے گُرو بن کر!"

اور پھر وہ پلٹ کر اپنے ایک وزیر سے کہنے لگا۔ "سارنگ بابا اور انوشا جی کو نہایت عزّت اور احترام سے رکھا جائے۔ اُنہیں کسی قسم کی تکلیف نہ ہونے پائے۔"

کالی داس اور شکنتلا

سکندر بادشاہ کے دربار کی داستان ایک بار پھر ہمارے ساتھ دہرائی جا رہی تھی۔
ہم سکندر کے دوست، ساتھی اور صلاح کار بن کر اُس کی واپسی تک یُوں اُس کے
ساتھ رہے تھے جیسے آدمی کا سایہ اُس کے ساتھ رہتا ہے مگر بیاس کے کنارے
یُونانی سپاہیوں کے آگے بڑھنے سے اِنکار کے واقعے کے علاوہ اور کسی بات میں
سکندر نے ہماری رائے نہیں لی تھی۔ اب اگرچہ سُمُدر گُپت نے ہمیں اپنا گُرو مان
کر اپنے پاس ٹھہرالیا تھا مگر اب اپنی سلطنت کی مصروفیتوں نے اُسے اِس بُری

طرح اُلجھا لیا تھا کہ اُسے بِین کی کوئی نئی دُھن سیکھنا تو ایک طرف رہا، بِین ہاتھ میں لینے کی بھی فُرصت نہ ملی۔ وہ اپنے کاموں میں اُلجھا رہا اور ہم محل کے ایک کونے میں پڑے روٹیاں توڑتے رہے۔

اِس بات کا فائدہ اگر کسی نے اُٹھایا تو وہ سُمُدر گُپت کے بیٹے چندر گُپت کی بیوی ستیہ وتی اور اُس کے بچّے پربھاوتی اور کمار گُپت تھے۔ پربھاوتی تو سارنگ بابا سے اِس حد تک مانوس تھی کہ ایک پل کے لیے اُن سے جُدا نہ ہوتی تھی۔ اُس کے اصرار پر سارنگ بابا نے بِین کی چند دُھنیں بھی اُسے سِکھا دی تھیں۔

سُمُدر گُپت کے مرنے کے بعد چندر گُپت گدّی پر بیٹھا تو اُس نے سب سے پہلے پُورب کے اُن راجاؤں کی خبر لی جو باغی ہو گئے تھے۔ پُورب کی مہم سر کرنے کے بعد اُس کی نظریں پچھّم اور جنوب میں مالوہ اور گجرات کی ریاستوں پر پڑنے لگیں جہاں اب بھی ساکا راجاؤں کا راج تھا مگر اُن سے پہلے وکاتک سلطنت سے معاملہ نپٹانا ضروری تھا کیونکہ وکاتک راجا کی دوستی یا دُشمنی بہت اہمیّت رکھتی تھی۔ اُس

نے اِس معاملے کو یُوں نبٹایا کہ اپنی بیٹی پربھاوتی کی شادی وکاتک راجا رودر سین دوم سے کر دی اور اِس شادی کے نتیجے میں ہم پربھاوتی کے ساتھ پاٹلی پُتر سے ایک بار پھر ناگ پُور پہنچ گئے۔

مگر ناگ پُور میں زیادہ عرصے تک رہنا ہماری قسمت میں نہ تھا۔ چندر گُپت نے گجرات اور مالوہ فتح کیا تو مالوہ کے شہر اُجیّن کو اپنی دوسری راجدھانی بنالیا اور پھر پاٹلی پُتر کے بجائے اُجیّن ہی اُس کی اصل راجدھانی بن گیا۔ اِس کے ساتھ ہی اُس نے مالوہ کے ایک پُرانے راجا کے نام پر بکرماجیت یا وکرمادتیہ کا لقب اختیّار کیا جس کے معنے "طاقت کا سورج" ہیں۔

اِس موقع پر اُجیّن میں ایک بہت بڑا جشن ہوا، اور اِس جشن میں شامل ہونے کے لیے چندر گُپت نے ہمیں پربھاوتی سمیت بُلوا بھیجا۔ اُس وقت پربھاوتی ایک لڑکے کی ماں بن چُکی تھی، جس کا نام دوار کر سین رکھا گیا تھا۔ اتّفاق سے اُس لڑکے کی اَن پراسن کی خوشی بھی قریب ہی تھی۔ یہ وہ موقع ہوتا ہے جب بچّے کے مُنہ کو

پہلی بار اناج لگایا جاتا ہے۔ لوگ اپنی اپنی حیثیت کے مطابق اِس تقریب کو مناتے ہیں اور طرح طرح سے خوشی کا اظہار کرتے ہیں۔ دوار کر سین تو راجا کا بیٹا اور مہاراجا کا دوہتا تھا۔۔۔ پربھاوتی نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنے بیٹے کی خُوشی اپنے باپ کے پاس ہی میں منائے گی۔

ہم اُجیّن پہنچے تو اُس کی سج دھج اور شان دیکھ کر پاٹلی پُتر کو بھول گئے۔ بکرماجیت کی راجدھانی بننے سے پہلے بھی اُجیّن ایک اہم شہر تھا اور نہ صرف تجارتی مرکز تھا بلکہ علم و ادب کا بھی مرکز تھا مگر چندر گُپت بکرماجیت کی راجدھانی بننے کے بعد اُس کی شہرت کو چار چاند لگ گئے تھے۔

مُلک بھر کے عالم، شاعر اور سائنس دان بکرماجیت کے دربار میں آ جمع ہوئے تھے۔ یہاں امر سنگھ تھا جس نے امر گوش کے نام سے سنسکرت زبان کی ڈکشنری لکھی تھی۔ یہاں ڈنڈین تھا جس نے شاعری کی کتاب "کوی درس" لکھی تھی۔ یہاں شدّرک تھا جس نے مریچھ کیتک (مٹّی کی گاڑی) نام کا ناٹک لکھا تھا جس میں

اُجیّن شہر کی تہذیب کو بڑی خوبصورتی سے پیش کیا گیا تھا۔ یہاں بھیروی تھا جس نے مشہور کتاب کرتن جوینہ لکھی تھی۔ یہاں دراہ مہر تھا جس نے اُس وقت کی تمام سائنسی معلومات کو اپنی کتاب "بر بُہت سمہتا" نظم کی صُورت میں پیش کیا تھا۔ یہاں آریہ بھٹ جیسا حساب دان تھا جس نے اپنی کتاب "سُوریہ سدھانت" میں سورج گرہن اور چاند گرہن کی اصلی وجہ بیان کی تھی اور زمین کی پیمائشوں کا حساب لگایا تھا۔ یہاں وشا کھادت تھا جس نے شیش ناگ کے بیٹے چندر گپت موریہ کی نند خاندان کے آخری راجا پر فتح کو ناٹک کی صورت میں پیش کیا تھا۔ اِس ڈرامے کا نام "مدراکشس" تھا۔ یہاں برہم گُپت تھا جو یونانیوں کے سائنسی علوم کا ماہر تھا۔

مگر اِن سب سے بڑھ کر یہاں وہ کالی داس تھا جو ناٹک کی دُنیا میں اپنا جواب نہیں رکھتا تھا۔ اُس نے اگنی مترا مالا ویکا نام کے ناٹک میں سُنگ خاندان کے راجا اگنی مترا کی زندگی کا ایک واقعہ پیش کیا تھا۔ اُس نے "رگھو رامسہ" میں راجا دسرتھ کے بیٹے رام چندر جی کے واقعات بیان کیے تھے۔ "میگھ دُوت" میں اُس نے

برسات کے ایک بادل کا افسانہ بیان کیا تھا۔ ''کمار سمبھوا'' میں اُس نے جنگ کے دیوتا کی پیدائش کا حال ایک طویل نظم کی صورت میں لکھا تھا اور ''ریتو سمہارا'' میں اُس نے مُلک کے چھ موسموں کا نقشہ بڑی خوب صورتی سے کھینچا تھا۔۔۔ مگر اُس کا ہمیشہ کے لیے زندہ رہنے والا ناول ''شکُنتلا'' ہے جس میں اُس نے راجا دُشینت اور شکُنتلا کی داستان بیان کی ہے۔

شکُنتلا کی کہانی اُس دور سے تعلّق رکھتی ہے جب ہستنا پُور کی راج گدّی پر پورو خاندان کا راجا دُشینت راج کرتا تھا۔ راجا دُشینت کو شکار کا بہت شوق تھا۔ ایک بار وہ شکار کی مہم پر نکلا تو جنگل میں ایک ہرن کا تعاقب کرتے ہوئے اپنے ساتھیوں سے بچھڑ کر مالینی ندی کے کنارے کونوارِشی کے آشرم میں پہنچ گیا۔ اِس آشرم میں کانوارِشی اور اُس کے چیلے گیان دھیان میں مصروف رہتے تھے۔ اِسی آشرم میں راجا نے ایک بھولی بھالی لڑکی کو دیکھا۔ اُس لڑکی کا نام شکُنتلا تھا۔ وہ کوشیک رِشی اور میماکا پری کی بیٹی تھی، مگر اُس کی پرورش کانوارِشی کے آشرم میں ہوئی تھی۔ راجا دُشینت نے شکُنتلا سے شادی کرلی۔ چند روز وہ آشرم ہی میں اُس کے

پاس رہا۔ پھر اُس نے اپنی انگوٹھی شکُنتلا کو نشانی کے طور پر دی جس پر راجا کا نام کھُدا ہوا تھا۔ اُس نے وعدہ کیا تھا کہ وہ جاتے ہی اپنے محل سے شاہی رتھ اور سپاہیوں کا دستہ بھیج دے گا۔

کونو اِرشی اُس وقت آشرم میں موجود نہ تھا اور کسی تیرتھ کی یاترا کے لیے گیا ہوا تھا۔ راجا دُشینت کے جانے کے دوسرے تیسرے روز شکُنتلا آشرم کے دروازے میں بیٹھی تھی۔ اُس کا دِل راج محل کے خیالوں میں کھویا ہوا تھا کہ کانوا رِشی کا ایک دوست دُرداس رِشی وہاں آیا۔ شکُنتلا کو دُرداس کے آنے کا پتا ہی نہ چلا۔ دُرداس نے جب یہ دیکھا کہ شکُنتلا نے اُٹھ کر اُس کا اِستقبال نہیں کیا تو اُس نے اُسے بددُعا دی:

”جا، جِس کے خیال میں پڑ کر تُو ہمیں بھول گئی ہے، وہ بھی تُجھے بھول جائے۔“

اور پھر وہ غصّے کی حالت میں پیر پٹختا ہوا واپس چلا گیا۔ شکُنتلا کو نہ کسی کے آنے کی خبر ہوئی نہ جانے کی، مگر اُس کی سہیلیوں نے یہ سب کُچھ سُن لیا۔ وہ بھاگم بھاگ

دُرداس کے پاس پہنچیں اور شکُنتلا کی طرف سے صفائی پیش کرتے ہوئے اُس سے بد دُعا واپس لینے کی درخواست کی۔ اِس پر دُرداس رِشی نے کہا۔ ”ہمارے ہونٹوں سے نکلا ہوا ہر لفظ پتھّر کی لکیر ہوتا ہے۔ راجا اُسے بھول جائے گا۔۔ مگر جب وہ اپنی دی ہوئی انگوٹھی دیکھے گا تو اُسے سب کُچھ یاد آ جائے گا۔“

کانوارِشی تیرتھ یاترا سے واپس آیا تو اُسے سارے معاملے کی خبر ہو گئی۔ وہ خوش تھا کہ شکُنتلا کی شادی ایک ایسے راجا سے ہوئی ہے جو اپنے وقت کا سب سے زبردست راجا ہے۔ مگر دِن پر دِن گُزرتے جارہے تھے اور راجا کی طرف سے کوئی آدمی شکُنتلا کو لینے نہیں آیا تھا۔

جب راجا کے آنے کی کوئی آس نہ رہی تو کانوارِشی نے شکُنتلا کو راجا دُشینت کے پاس بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ اُس نے اپنے دو چیلوں شراودت اور شرنگردا اور آشرم کی ایک بُوڑھی عورت گوتمی کو حکم دیا کہ وہ شکُنتلا کو اُس کے شوہر کے پاس چھوڑ آئیں۔

گوتمی، شراودت اور شرنگردا شکُنتلا کو لے کر ہستنا پور کی طرف روانہ ہوئے۔ آشرم سے روانہ ہوتے وقت شکُنتلا کی سہیلیوں نے اُسے راجا دُشینت کی دی ہوئی انگوٹھی کی حفاظت کی سخت تاکید کی کیونکہ اُنہیں رِشی دُرداس کی بات خوب یاد تھی۔ مگر جب وہ ہستنا پُور کو جاتے ہوئے دریائے گنگا کے کنارے ساچی تیرتھ کے مقام سے گُزرے تو شکُنتلا گنگا کے پانی سے مُنہ ہاتھ دھونے لگی اور انگوٹھی اُس کی انگلی نکار کا اگر اس کی انگلی سے نکل کر دریا میں جا گری۔ اُس بے چاری کو پتا بھی نہ چلا۔

وہ راجا دُشینت کے محل کے دروازے پر پہنچے اور اندر اطلاع بھجوائی۔ راجا دُشینت کو جب یہ معلوم ہوا کہ کانوا رِشی کے آشرم سے کُچھ لوگ آئے ہیں تو اس نے اُنہیں اُسی وقت دربار میں بُلوا لیا مگر جب شراودت اور شرنگردا نے شکُنتلا کی طرف اِشارہ کرتے ہوئے کہا کہ مہاراج! یہ آپ کی بیوی ہے اور ہم کانوا مہاراج کے حکم کے مطابق اِسے آپ کے پاس لائے ہیں تو اُس نے شکُنتلا کو پہچاننے سے اِنکار کر دیا۔ شکُنتلا نے اُسے آشرم میں گزارے ہوئے دِنوں کے

واقعات یاد دِلانے کی کوشش کی لیکن راجا کو نہ شکُنتلا کے ساتھ شادی یاد تھی اور نہ آشرم میں گُزارے ہوئے دِن یاد تھے۔ آخر شکُنتلا کو اُس انگوٹھی کا دھیان آیا جو راجا نے نشانی کے طور پر دی تھی مگر جب اُس نے یہ نشانی راجا کو دِکھانے کی خاطر انگلی کی طرف ہاتھ بڑھایا تو انگلی خالی تھی!

شکنتلا سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ راج محل میں آکر یہ معاملہ پیش آئے گا۔ شراودت، شر نگر دا اور گوتمی اُسے واپس آشرم میں لے جانے کے لیے تیّار نہ تھے اور راجا دُشینت اُسے اپنی بیوی تسلیم نہیں کر رہا تھا اور وہ سوچ رہی تھی کہ کہاں جائے!

آخر راج محل کے داروغہ نے راجا سے کہا۔ ''مہاراج اِس عورت کو میں اپنے گھر لے جاتا ہوں۔ بے چاری بے آسرا ہے، کہاں دَر دَر کی ٹھوکریں کھاتی پھرے گی۔''

راجا نے اجازت دے دی۔ شر نگر دا اور گوتمی شکُنتلا کو داروغہ کے حوالے کر کے

واپس چلے گئے۔ داروغہ شکُنتلا کو ساتھ لیے راج محل سے نکلا تو شکُنتلا نے اپنی قسمت پر آنسو بہاتے ہوئے آسمان کی طرف دونوں ہاتھ اُٹھائے۔ عین اُسی وقت، ایک جگمگائی روشنی ایک عورت کی شکل میں نمودار ہوئی اور شکُنتلا کو اُٹھا کر کہیں غائب ہو گئی۔۔۔ یہ اصل میں شکُنتلا کی ماں میما کا پری تھی۔

راجا دُشینت اور اُس کے درباری حیران ہی ہو رہے تھے کہ دو سپاہی ایک مچھیرے کو پکڑ لائے۔ وہ راجا دُشینت کی انگوٹھی بازار میں فروخت کرنے کی کوشش کر رہا تھا اور سپاہیوں کو شک تھا کہ اُس نے انگوٹھی راج محل سے چُرائی ہے، ورنہ راجا کی انگوٹھی، ایک مچھیرے کے ہاتھ کیسے لگ سکتی ہے۔ مچھیرے کا کہنا تھا کہ یہ انگوٹھی اُسے ایک مچھلی کے جبڑوں میں پھنسی ہوئی ملی ہے مگر سپاہی اُس کی بات کا اِعتبار کرنے کو تیار نہ تھے۔

سپاہیوں نے مچھیرے کو راجا دُشینت کے سامنے پیش کیا تو انگوٹھی دیکھتے ہی اُسے سب کُچھ یاد آ گیا۔ اُس نے مچھیرے کو انعام دے کر رُخصت کیا اور خُود فکر کے

گہرے سمندر میں ڈوب گیا۔

راجادُشینت کا بُرا حال تھا۔ کھانا پینا، راج پاٹ، سیر شکار کسی بات سے اُسے دِلچسپی نہ تھی۔ اُس کے درباری طرح طرح سے اُس کا دِل بہلانے کی کوشش کرتے تھے مگر اُس نے شکُنتلا کے ساتھ جو ظالمانہ سلوک کیا تھا۔ اُس کے پچھتاوے نے اُس کے دِل میں گھاؤ ڈال دیے تھے اور دِل کے یہ گھاؤ اُسے دِن رات بے چین کیے رکھتے تھے۔

اُدھر شکُنتلا کو اُس کی ماں میماکا پری نے سُنہری پہاڑ پر مریچی کے بیٹے کیشپ رِشی اور اُس کی بیوی آدیتی کے آشرم میں پہنچا دیا تھا۔ کیشپ رِشی اپنے وقت کا پہنچا ہوا رِشی تھا۔ اُس نے ایک ہی جگہ بیٹھے بیٹھے گیان دھیان میں اتنا عرصہ گزار دیا تھا کہ اُس کا جسم سوکھ کر کانٹا بن گیا تھا۔ درختوں اور پودوں کی بیلیں اُس کے بدن سے لپٹ گئی تھیں اور پرندوں نے اُس کے سر کے بالوں میں گھونسلے بنا لیے تھے۔ مگر اِن باتوں نے اُس کے گیان دھیان میں ذرا سا بھی نہیں ڈالا تھا۔

کیشپ رِشی کے آشرم میں پہنچ کہ شکُنتلا کے ہاں ایک لڑکا پیدا ہوا۔ کیشپ نے لڑکے کا نام بھرت رکھا اور حفاظت کے خیال سے ایک تعویذ بھی اُس کے بازو پر باندھ دیا۔

راجا دُشینت کئی سال تک روتا اور آنسو بہاتا رہا اور پھر قُدرت کا زبردست ہاتھ ایک روز اُسے سُنہری پہاڑ پر کیشپ رِشی کے آشرم کے سامنے لے آیا۔ یہاں اُس نے ایک لڑکے کو دیکھا جو ایک شیر کے بچّے کو پکڑے اُس کا مُنہ اپنے ہاتھوں سے کھولنے کی کوشش کر رہا تھا۔

آشرم کی دو عورتیں شیر کے بچّے کو اُس لڑکے سے چھُڑانے کی کوششیں کر رہی تھیں۔ مگر وہ کسی طرح نہ مانتا تھا۔ اُنہوں نے گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھا تو سامنے راجا کو کھڑے پایا۔ وہ اُس سے کہنے لگیں:

"ہماری مدد کیجیے۔ اِس بچّے کو اُس لڑکے سے چھُڑا لیجیے۔"

راجا نے لڑکے سے کہا۔ ”اور رِشی کے بیٹے! تُو جو کُچھ کر رہا ہے، وہ اچھّا نہیں ہے۔ تیرا باپ تو جانوروں کے ساتھ بھی مہربانی سے پیش آتا ہے۔

اِس پر ایک عورت بولی۔ ”مہاراج! یہ رِشی کا بیٹا نہیں ہے۔“

”ہاں، لگتا تو یہی ہے۔“ راجا دُشینت نے کہا اور پھر شیرنی کے بچّے کو لڑکے کے ہاتھ سے چھُڑا دیا۔ ”اِس بچے کو چھُونے سے مُجھے ایک عجیب سی خُوشی کا احساس ہوا ہے۔ نہ جانے کِس خوش قسمت کا یہ بیٹا ہے۔“

ایک عورت بولی۔ ”کمال ہے! کمال ہے!“

”کیا بات ہے؟“ راجا نے پوچھا۔ ”تُم کِس بات پر حیران ہو رہی ہو؟“

”مہاراج!“ اُس عورت نے جواب دیا۔ ”آپ دونوں کی شکل بڑی ملتی جُلتی ہے، حالانکہ دونوں میں کوئی رشتہ، ناتا بھی نہیں۔ یہ لڑکا آپ کو جانتا تک نہیں، پھر بھی دم بھر میں آپ سے مانوس ہو گیا ہے۔“

راجا نے لڑکے کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ”اگر یہ رِشی کا بیٹا نہیں ہے تو پھر اِس کا خاندان کون سا ہے؟“

”پورو کا خاندان۔“ عورت نے جواب دیا۔

”تو اِس کا خاندان وہی ہے جو میرا ہے۔“ راجا نے کہا۔ ”لیکن یہ یہاں کیسے آ گیا؟“

”اِس کی ماں کو ایک پری یہاں چھوڑ گئی تھی اور یہ کیشپ رِشی کے آشرم میں پیدا ہوا تھا۔“

”اور وہ شخص کون ہے جس کی وہ بیوی تھی؟“ راجا دُشینت نے پوچھا۔

”اُس کا نام کون اپنی زبان پر لا سکتا ہے۔ اُس نے تو اپنی بیوی کو ٹھکرا دیا تھا۔“ راجا دُشینت نے سوچا کہ یہ تو میری اپنی ہی کہانی معلوم ہوتی ہے۔ وہ یہ حوصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ بچّے سے اُس کی ماں کا نام پوچھے۔ لیکن جلد ہی اُن عورتوں سے اُسے

معلوم ہو گیا کہ بچّے کی ماں کا نام شکُنتلا ہے۔ اِتنے میں ایک عورت مٹّی کا بنا ہوا ایک خوب صورت مور نے آئی۔ بچّے نے اُسے لینے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو عورت حیران رہ گئی۔

"ارے! اِس کے بازو کا تعویذ کہاں گیا؟"

"گھبر اؤ نہیں!" راجا دُشینت نے کہا۔ "اس کا تعویذ شیر کے بچّے کا مُنہ کھولنے کی کوشش کرتے ہوئے گر گیا تھا۔ یہ رہا۔"

یہ کہتے ہوئے راجا نے اُس تعویذ کو اُٹھانے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو عورت چیخ اُٹھی

"ارے ہاتھ نہ لگایئے، اِسے ہاتھ نہ لگایئے!"

مگر راجا دُشینت نے تعویذ اُٹھا کر بچّے کے بازو میں باندھ دیا۔ دونوں عورتیں خوف سے ایک دوسری کی طرف دیکھنے لگیں۔

"کیا بات ہے؟" راجا نے کہا۔ "تُم نے مُجھے روکنے کی کوشش کیوں کی تھی؟"

”سُنئیے!“ ایک عورت نے کہا۔ ”یہ تعویذ کیشپ مہاراج نے بچّے کی حفاظت کے لیے اُس کے بازو پر باندھا تھا۔ اگر یہ زمین پر گر پڑے تو اِس کے سوا یا اِس کے ماں باپ کے سوا کوئی اِسے نہیں اُٹھا سکتا۔“

”اور اگر کوئی اور اِسے ہاتھ لگا لے تو؟“

”تو یہ فوراً ناگ بن کر اُسے ڈس لیتا ہے۔“

”کیا تُم نے ایسا ہوتے دیکھا ہے؟“ راجا نے پوچھا۔

”ہاں، ایک بار نہیں کئی بار۔“

اس پر راجا نے کہا۔ ”تو پھر آج میری خُوشی مجُھے مل گئی ہے۔“

یہ کہتے ہوئے راجا دُشینت نے لڑکے کو اپنے سینے سے لگا لیا۔ یہ ماجرا دیکھ کر ایک عورت دوڑی دوڑی گئی تاکہ شکُنتلا کو اُس کی خبر کر سکے۔ اتنے میں لڑکے نے بے چین ہو کر کہا۔

”مُجھے چھوڑ دو۔ میں اپنی ماں کے پاس جانا چاہتا ہوں۔“

”میرے بیٹے!“ راجا نے کہا۔ ”تُم میرے ساتھ جاؤ گے۔ اپنی ماں کے پاس۔“

”میرا باپ دُشینت ہے۔ تُم نہیں ہو۔“

راجا نے مُسکراتے ہوئے کہا۔ ”تُم نے یہ کہہ کر میرا رہا سہا شک بھی دُور کر دیا ہے۔“

اتنے میں شکُنتلا دوڑی دوڑی آئی اور عورت سے کہنے لگی۔ ”یہ میں نے کیا سُنا ہے کہ بھرت کا تعویذ ناگ نہیں بنا؟ کیا ایسا ہی ہوا ہے؟ کیا میرے دُکھ کی گھڑیاں بیت گئی ہے؟ مُجھے یقین نہیں آ رہا!“

راجا دُشینت شکُنتلا کو دیکھتے ہی پُکار اُٹھا۔ ”شکُنتلا، یہ میں دُشینت ہوں۔“

اور پھر اُس نے ایک ہی سانس میں سارا ماجرا کہہ ڈالا۔ اِس کے بعد میاں بیوی اپنے بیٹے کو ساتھ لے کر کیشپ رِشی اور آدیتی کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

اُنہوں نے دونوں کو مُبارک باد دی اور پھر اُن کی دُعائیں لے کر راجا دُشینت شکُنتلا اور بھرت کے ساتھ، خوشی کے شادیانے بجاتا، ہستناپُور واپس آ گیا۔

کالی داس کے اِس ناٹک کو جشن کے موقع پر پیش کیا گیا اور اُس نے کامیابی کے ایسے جھنڈے گاڑے کہ اُس وقت کے دوسرے ٹانک لکھنے والے بھاسا، سومیلا اور کوی پُترا کے ناٹکوں کو کوئی پوچھتا بھی نہ تھا۔ مُلک کے ایک سِرے سے دوسرے سِرے تک کالی داس اور اُس کے ناٹک شکُنتلا کا چرچا تھا۔

اِسی جشن میں ہم نے چینی سیّاح فاہیان کو بھی دیکھا جو گوتم بُدھ کا پیرو اور چین کا مذہبی عالم تھا۔ وہ یہاں بُدھ مت کے مقدّس مقامات کی زیارت کرنے اور بُدھ مت کی کتابیں اور گوتم بُدھ کے تبرکات حاصل کرنے آیا تھا۔ وہ اپنے چار ساتھیوں کے ساتھ چین سے روانہ ہوا تھا۔ صحرائے گوبی سے گُزر کر جب وہ پامیر کی بُلندیوں کو عُبور کرنے لگا تو اُس کے دو ساتھی سردی اور برف سے ہلاک ہو گئے اور دوسرے دو ہمّت ہار کر واپس چلے گئے۔ وہ اکیلا پہلے ٹیکسلا پہنچا اور پھر

مختلف جگہوں سے ہوتا ہوا بکرماجیت کے دربار میں آیا۔ وہ تین سال یہاں رہا اور بُدھ مت کے متعلّق ہر قسم کی معلومات جمع کرتا رہا۔ اِس کے بعد اُس نے سراندیپ، جاوا اور دُوسرے جزیروں کا سفر کیا اور پُورے پندرہ سال بعد جب وطن واپس پہنچا تو اُس نے یہاں کے حالات لکھے۔ بالکل اسی طرح جس طرح اس میگستھنیز نے لکھے تھے جسے سیلوکس نے چندر گُپت موریہ کے دربار میں اپنا سفیر مقرّر کیا تھا۔

بکرماجیت کا دوہتا

جشن کے کوئی دس دِن بعد راج کُمار کرسین کے مُنہ کو اناج لگانے کی تقریب میں زیادہ تر وہ عورتیں شامل تھیں جو شاہی خاندان یا بکرماجیت کے درباری امیروں وزیروں کے گھروں سے تعلّق رکھتی تھیں۔

اس تقریب میں بکرماجیت ایک اُونچے تخت پر بیٹھا تھا۔ اِس کے ساتھ ہی ایک ذرا چھوٹے تخت پر اُس کا بیٹا کمار گُپت تھا۔ اِس کے ساتھ پر بھاوتی اپنے بیٹے دوار کرسین کو گود میں لیے بیٹھی تھی۔ ان دونوں سے ذرا ہٹ کر ایک پنڈت بیٹھا تھا

اور اُس سے چند قدم کے فاصلے پر سارنگ بابا! اور میری نشست تھی۔ پہلے پنڈت نے چند منتر پڑھے، پھر چند لڑکیوں نے بھجن گائے اور اِس کے بعد پنڈت نے اپنے قریب پڑے ہوئے تھال سے روٹی کا ایک ٹکڑا اُٹھا کر راج کُمار دوار کر سین کے مُنہ میں ڈالا اور اِس کے ساتھ ہی مبارک سلامت کا شور مچ گیا۔

شور تھما تو ناچنے گانے والی لڑکیوں نے اپنے اپنے ناچ گانے کا کمال دِکھانا شروع کیا، جِس کا سِلسِلہ شام تک جاری رہا۔ پھر سب سے آخر میں مہاراجا بکرماجیت کے دربار کی رقّاصہ آشا ایک پردے کی اوٹ سے نکل کر سامنے آئی۔

رات آدھی سے زیادہ بیت چُکی تھی، لیکن آشا ابھی تک نہیں تھکی تھی۔ اُس کا ناچ نہ جانے اور کتنی دیر جاری رہتا کہ خوف اور درد میں ڈوبی ہوئی ایک چیخ نے سب کو چونکا دیا۔ یہ چیخ راج کُمار کُمار گُپت کی تھی۔ بِین خُود بخود میرے ہونٹوں سے الگ ہو گئی اور اِس کے ساتھ ہی آشا کے ناچتے ہوئے قدم رُک گئے۔ میری نگاہیں فوراً مہاراجا بکرماجیت کے تخت کی طرف اُٹھیں۔ ایک سانپ نے کُمار

گُپت کی پنڈلی پر ڈس لیا تھا اور اب وہ بکرماجیت کی طرف بڑھ رہا تھا۔ میں اپنی جگہ سے چھلانگ لگا کر تخت کے قریب پہنچا اور اُس سانپ کو دبوچ لیا۔

چاروں طرف سانپ سانپ کا شور برپا ہوا اور ایک افراتفری سی مچ گئی۔ سارنگ بابا فوراً کُمار گُپت کے پاس پہنچے اور ذرا سی دیر میں سانپ کے کاٹے کا اثر دور کر دیا۔ میں نے ایک نظر سانپ کو دیکھا تو حیران رہ گیا۔ یہ ناگن تھی۔ میرا دھیان کانگ مار کی ناگن کی طرف گیا۔ یہ اُسی نسل کی ناگن معلوم ہوتی تھی!

افراتفری ختم ہوئی تو سب دوبارہ اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھ گئے اور پھر ایک نہایت حیرت انگیز بات سامنے آئی۔ پربھاوتی کی گود سے راج کُمار دوار کر سین غائب تھا۔ اور اِس کے ساتھ ہی آشا بھی!

یُوں لگتا تھا جیسے افراتفری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے آشا ننھے راج کُمار کو لے کر بھاگ گئی ہے۔ مہاراجا بکرماجیت کا خون کھول اُٹھا۔ اُس نے گرجتے ہوئے کہا:

”کہاں گئی آشا؟ اُسے فوراً گرفتار کر کے ہمارے سامنے پیش کیا جائے!“

حکم کی دیر تھی، گھڑسوار چاروں طرف پھیل گئے۔ اُنہیں یقین تھا کہ وہ ذرا کی ذرا میں آشا کو ننھے راج کُمار سمیت گرفتار کر کے مہاراجا بکرماجیت کے قدموں میں لا ڈالیں گے۔ مگر یہ اُن کی بھُول تھی۔ اُنہوں نے اُجیّن شہر کا کونا کونا چھان مارا، آس پاس کی بستیوں کے ایک ایک گھر کی تلاشی لے ڈالی مگر آشا اور راج کُمار کا کہیں پتا نہ چلا۔

دِنوں نہیں، ہفتوں آشا اور راج کُمار کی تلاش ہوتی رہی۔ اُجیّن سے پاٹلی پُتر تک اور گنگا سے نربدا تک کوئی بستی ایسی نہ تھی جہاں بکرماجیت کے سپاہی اُن کی تلاش میں نہ گئے ہوں مگر آشا اور راج کُمار کو ملنا تھا نہ ملے۔

ہم راج محل کے مہمان خانے میں پڑے روٹیاں توڑ رہے تھے۔ آشا اور راج کُمار کی تلاش میں جو بھاگ دوڑ ہو رہی تھی، اُس کی خبر ہمیں برابر ملتی رہتی تھی۔ جِس ناگن نے کمار گُپت کی پِنڈلی پر ڈسا تھا، وہ سارنگ بابا کی قید میں تھی، مگر اُس کا آشا سے کوئی تعلّق نہ تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُس کا وہاں آنِکلنا محض ایک اتّفاقی بات

تھی۔ پربھاوتی اپنے بیٹے کی جُدائی میں بے چین تھی اور بکرماجیت اپنی بیٹی کی بے چینی دیکھ کر بے چین تھا، مگر سارنگ بابا کے لیے جیسے کوئی بات ہی نہ تھی۔ اُنھوں نے ایک بار بھی آشا یا راج کُمار کا ذکر نہیں کیا تھا۔ میں اِس کی وجہ جانتا تھا۔ اِس لیے کہ مُجھے یُوں لگتا تھا جیسے ہمارے ساتھ ایک بار پھر مہاراجا پورس کے دربار والا کھیل کھیلا جا رہا ہے۔

جب مہاراجا بکرماجیت کے سپاہی آشا اور ننھے راج کُمار کی تلاش میں ناکام ہو گئے تو پھر اُسے سارنگ بابا اور انوشا کا خیال آیا، اور ٹھیک آدھی رات کے وقت وہ اُس مہمان خانے میں آیا جہاں ہمیں ٹھہرایا گیا تھا۔ سارنگ بابا کو پہلے سے اِس کا اندازہ تھا۔ وہ مُجھے باتوں میں لگائے وقت گزار رہے تھے۔ دروازہ کھُلا تھا۔ جیسے ہی مہاراجا بکرماجیت نے دہلیز کے اندر قدم رکھا۔ ہم نے اُٹھ کر آداب کیا۔ سارنگ بابا کہنے لگے۔

”مہاراج! آپ اور یہاں! آپ نے ہمیں کیوں نہ بُلوالیا؟“

بکرماجیت اُداسی سے ہنسا اور بولا۔ ”اِس وقت مہاراج ہم نہیں، آپ ہیں۔ میں یہاں اُس پریشانی کا علاج ڈھنڈنے آیا ہوں جس نے میرا دِن کا چین اور رات کا آرام چھین لیا ہے۔؛

”حکم کیجیے مہاراج!“ سارنگ بابا نے کہا۔ ”ہم جوگیوں اور سنیاسیوں کا تو کام ہی دوسروں کی خدمت کرنا ہے۔“ بکرماجیت نے چند لمحے خاموشی اختیار کی، پھر کہنے لگا۔ ”آپ کو دوار کر سین کے ان پراسن کی تقریب کی رات تو یاد ہو گی، جب ایک سانپ نے کمار گُپت کو ڈس لیا تھا اور آشا غائب ہو گئی تھی؟“

”بڑی اچھّی طرح یاد ہے۔“ سارنگ بابا نے کہا۔ ”راج کُمار کی قسمت اچھّی تھی کہ ہم نے فوراً ہی اُس کے جسم سے سانپ کا زہر نکال دیا۔ میری دُعا ہے کہ قُدرت کُمار گُپت کو ہر مُصیبت سے دُور رکھے۔ اولاد غریب کی ہو یا امیر کی، جھونپڑی میں پلے بڑھے یا راج محل میں، ماں باپ کی آنکھوں کی روشنی ہوتی ہے۔“

"یہی بات میں کہنے والا تھا۔" مہاراجا بکرماجیت نے کہا۔ "آپ جانتے ہی ہیں کہ آشا کے ساتھ راج کُمار دوار کر سین بھی غائب ہے۔ پربھاوتی بیٹی کی بے چینی مُجھ سے دیکھی نہیں جاتی۔ سپاہیوں نے اُجیّن سے پاٹلی پُتر تک اور گنگا سے نربدا تک ایک ایک شہر ایک ایک بستی کو دیکھ ڈالا ہے لیکن نہ آشا کا پتا چلا ہے نہ راج کُمار کا۔

"ہو سکتا ہے آشا نربدا کے پار چلی گئی ہو۔" سارنگ بابا نے کہا۔

"نربدا کے پار!" بکرماجیت نے کہا۔ "آپ شاید مذاق کر رہے ہیں۔ ایک لڑکی ذرا سی دیر میں اُجیّن سے نربدا کے پار کیسے پہنچ سکتی ہے۔ کیا وہ کوئی بھُوت پریت تھی؟"

"یہ تو وہی جانے۔" سارنگ بابا نے آسمان کی طرف اِشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "لیکن آپ نے شکُنتلا کا ناٹک دیکھا ہے۔ کیا شکُنتلا پل بھر میں راجا دُشینت کے محل سے کیشپ رِشی کے آشرم میں نہیں پہنچ گئی تھی؟"

”وہ تو میما کا پری کی مہربانی تھی۔“ بکرماجیت نے کہا۔

”یہ بھی کسی کی مہربانی ہو سکتی ہے؟“

”یہ کیسی مہربانی ہے جو ایک ماں سے اُس کا بیٹا چھین لیتی ہے۔“ بکرماجیت نے چیخ کر کہا۔ ”مُجھے اِس سے کوئی غرض نہیں کہ آشا نربدا کے پار چلی گئی ہے یا سات سمندر پار گئی ہے۔ میں تو اپنے دوست کے لیے بے چین ہوں۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ اپنی کامیابی کا اتنا بڑا جشن منانے کے بعد مُجھے یُوں ذلّت اُٹھانا پڑے گی۔ کہنے کو پچھّم سے پُورب تک میرے نام کا ڈنکا بجتا ہے، لیکن میں جتنا بے بس اِس وقت ہوں، پہلے کبھی نہ تھا۔ مجھے نہیں تھا کہ اتنی بڑی سلطنت کا مالک ہوتے ہوئے بھی میں اتنا مجبور اور بے بس ہو سکتا ہوں۔ میری اِمداد کیجئے بابا جی! میں آپ کے آگے ہاتھ جوڑتا ہوں۔ آپ کہنے کو جوگی سہی لیکن میں جانتا ہوں کہ آپ بہت کُچھ ہیں۔ آپ اور انوشا جی نے پاٹلی پُتر میں گھوڑے کی قُربانی کے جشن میں رنجن ناگ کے مُقابلے میں جو کُچھ کیا تھا، وہ مجھے آج بھی یاد ہے۔ مُجھ سے

بھُول ہوئی۔ مجُھے پہلے دِن ہی آپ کی خدمت میں آنا چاہیے تھا۔

"نہیں، مہاراج!" سارنگ بابا بولے۔ "آپ اپنے وقت پر آئے ہیں۔ قُدرت آپ کو یہ احساس دِلانا چاہتی تھی کہ ایک انسان دُنیا کی ساری طاقت کا مالک ہونے کے باوجود کتنا بے بس ہو سکتا ہے۔ آپ چندر گُپت سے چندر گُپت بکرماجیت بن گئے ہیں۔ طاقت کے سورج کا لقب اختیار کر کے آپ نے یہ سمجھ لیا تھا کہ اب دُنیا پر آپ ہی کی مرضی چلے گی۔ آپ بھول گئے تھے کہ اس دُنیا پر قُدرت کی اَن دیکھی طاقتوں کی مرضی چلتی ہے۔

راجا طاقت اور حکومت کے نشے میں یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ اب دُنیا اُن کی غُلام ہے اور اُن کے حکم کے بغیر ایک پتّا بھی نہیں ہل سکتا مگر قُدرت بڑے بڑے سورماؤں کی طاقت کا پل بھر میں ناس کر دیتی ہے۔ انسان کتنا مُورکھ ہے کہ طاقت کے غرور میں اپنے آپ کو خُدا سمجھنے لگتا ہے۔"

"لیکن بابا جی۔" بکرماجیت نے کہا۔ "میں نے تو ایک پل کے لیے بھی اپنے آپ کو

ایسا نہیں سمجھا۔"

"لیکن آپ کو اپنی حکومت، اپنی فوج، اپنی طاقت پر مان تو تھا۔ آپ سمجھتے تھے کہ آپ کے سپاہی آشا اور ننھے راج کُمار کو پاتال سے بھی ڈھونڈ لائیں گے۔ آپ اُس وقت یہاں آئے ہیں جب اپنی حکومت اور طاقت کا سارا زور لگا کر بھی آشا اور راج کُمار کا پتا نہ چلا سکے۔"

"مُجھ سے بھول ہوئی، بابا جی۔" بکرما جیت نے کہا۔ "بہت بڑی بھول ہوئی۔۔۔ میری غَلَطی بخش دیجیے اور میری امداد کیجیے۔" یہ کہتے ہوئے بکرما جیت نے سارنگ بابا کے ہاتھ تھام لیے۔

سارنگ بابا نے بکرما جیت کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں آنکھوں سے لگایا اور کہنے لگے۔ "ایسا نہ کہیے۔ آپ اِس دھرتی کا مان ہیں۔ آپ ایسے راجا ہیں جنھیں دُنیا والے رہتی دُنیا تک یاد رکھیں گے۔"

پھر سارنگ بابا مُجھ سے کہنے لگے۔ "انوشا بیٹے، قُدرت نے تمہیں وہ طاقت بخشی ہے کہ بڑے بڑے راجاؤں نے تمہارے آگے سر جھُکایا ہے اور بڑے بڑے بلوانوں نے تمہارے سامنے کان پکڑے ہیں۔ ذرا دیکھو تو سہی کہ مہاراج کی آشا اور راج کُمار دوار کر سین کہاں ہیں؟"

سارنگ بابا کے اِن الفاظ کے ساتھ ہی میں نربدا اور وندھیا چل کے پار ناگ پور میں دو کا تک راجا رودر سین دوم کے محل میں پہنچ گیا، اور اُس محل میں میری آنکھوں نے وہ منظر دیکھا جو کسی کے خواب و خیال میں بھی نہ سکتا تھا۔ راجا رودر سین تخت پر بیٹھا تھا اور راج کُمار دوار کر سین اُس کی گود میں تھا۔ اِرد گِرد کرسیوں پر اُس کے درباری بیٹھے تھے، اور اُن سب کے درمیان آشا کھڑی تھی۔ اُجیّن میں ننھے راج کُمار کی ماں اور اُس کا نانا اُس کے لیے تڑپ رہے تھے اور یہاں ناگ پور میں وہ بڑے مزے سے اپنے باپ کی گود میں بیٹھا ہوا انگوٹھا چوس رہا تھا۔ مُجھے دیکھتے ہی راجا رودر سین نے اپنا ہاتھ بُلند کیا اور کہا۔ "آؤ، آؤ انوشا جی۔ ہم تمہارا ہی انتظار کر رہے تھے۔ ہم ابھی ابھی راج کُمار کے اَن پراسن کی

تقریب سے فارغ ہوئے ہیں۔"

"اَن پراسن کی تقریب!" میں نے حیرانی سے کہا۔ "یہ تقریب تو وہاں اُجیّن میں منائی گئی تھی اور اُس تقریب کے موقع پر آشا اور نیا راج کُمار غائب ہو گئے تھے۔"

"ہمیں معلوم ہے۔" راجا رودر سین نے کہا۔ "قُدرت نے اِن دونوں کو وہاں سے یہاں پہنچا دیا تھا۔ اپنے نجومیوں کے کہنے کے مطابق ہم نے اپنے بیٹے کے مُنہ کو اناج لگانے کا جشن یہاں بھی منایا ہے۔ آخر وہ ہمارا بیٹا بھی تو ہے۔ نجومیوں نے یہ بھی بتایا تھا کہ انوشا جی اِن دونوں کو لینے آئیں گے۔ سو تُم اُنہیں لے جا سکتے ہو۔ ہم اپنی رانی کو اور زیادہ بے چین نہیں رکھنا چاہتے۔"

یہ کہتے ہوئے راجا رودر سین نے راج کُمار کو آشا کو دیتے ہوئے کہا۔ "لو آشا، انوشا جی آ گئے ہیں۔ راج کُمار کو سنبھالو اور اِسے واپس رانی جی کے پاس لے جاؤ۔ ڈرو نہیں، انوشا جی تمہیں کُچھ نہیں کہیں گے۔" آشا ننھے راج کُمار کو لے کر میری

طرف آئی۔ ہم دونوں نے راجا رودر سین کو سلام کیا اور باہر کی طرف بڑھے۔ محل کے بڑے دروازے سے نکلتے ہی میرے کانوں ہمیں آواز آئی۔ یہ آواز سارنگ بابا کی تھی:

"لیجیے مہاراج! آشا اور ننھا راج کُمار آ گئے ہیں۔"

میں نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ میں ناگ پُور میں نہیں، اُجیّن میں تھا۔ آشا ننّھے راج کُمار کو گود میں لیے میرے پاس کھڑی تھی۔

آشا کو دیکھتے ہی مہاراجا بکرماجیت غصّے سے بے قابو ہو گیا۔ اُس نے راج کُمار کو آشا کی گود سے جھپٹ لیا اور بولا۔ "تُم۔۔۔ تُم کہاں سے آئی ہو؟"

"ناگ پور سے، مہاراج!" آشا نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

"ناگ پور سے! کب؟ کِس کے ساتھ؟"

"ابھی ابھی آئی ہوں، مہاراج۔" آشا نے جواب دیا۔ "تھوڑی دیر پہلے میں ناگ

پور میں راجا رودر سین جی کے محل میں تھی۔ انوشا جی مُجھے لے کے آئے ہیں۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" بکرماجیت نے حیرانی سے کہا۔

"انوشا بیٹے کے لیے سب کُچھ مُمکن ہے، مہاراج۔" سارنگ بابا نے کہا۔ "حیران نہ ہوں۔ جو کُچھ ہوا ہے، اُس میں قُدرت کی اَن دیکھی طاقتوں کا ہاتھ ہے۔ آشا ٹھیک کہہ رہی ہے۔"

محل میں ننھے راج کُمار کے مِل جانے کا شور مچ چُکا تھا۔ پربھاوتی دوڑی دوڑی آئی اور اُس نے اپنے بیٹے کو باپ کی گود سے لے لیا اور اُس کا مُنہ چومنے لگی۔ اتنی دیر میں آشا ساری کہانی سُنا چکی تھی۔ مہاراجا بکرماجیت نے پربھاوتی سے کہا۔

"ہم اتنے دِنوں تک مُفت میں پریشان ہوتے رہے۔ ہمیں معلوم نہیں تھا کہ قُدرت نے ننھے راج کُمار کو اُس کے باپ کی گود میں پہنچا دیا ہے۔ اب انوشا جی اُسے وہاں سے لائے ہیں۔ یہ اُن کی مہربانی ہے، اُن کی بھی اور سارنگ بابا کی

بھی۔"

پربھاوتی نے یہ سُن کر میرا اور سارنگ بابا کا شکریہ ادا کیا، اور پھر ننھے راج کُمار کو لے کر چلی گئی۔ مہاراجا بکرماجیت بھی اپنی بیٹی کے ساتھ ہی چلا گیا۔ ڈری سہمی آشا کانپتے قدم اُٹھاتے ہوئے اُن کے پیچھے پیچھے تھی۔ وہ ڈر رہی تھی کہ نہ جانے مہاراجا بکرماجیت کی طرف سے اُسے کیا سزا ملے۔ مگر بکرماجیت نے اُسے کوئی سزا نہیں دی۔ راج کُمار کے واپس مل جانے کی خوشی میں اور لوگوں کے علاوہ اُسے بھی بھاری انعام دیا گیا۔

ہم چند دِن اور اُجیّن میں رہے اور پھر وہاں سے چل کھڑے ہوئے۔ پربھاوتی دو مہینے اور اپنے باپ کے پاس اُجیّن میں ٹھہری رہی۔ پھر جب وہ ناگ پور واپس پہنچی تو دس بارہ روز بعد ہی راجا رودر سین اِس دُنیا سے رُخصت ہو گیا۔ پربھاوتی نے وکاتک سلطنت کی راج گدّی خُود سنبھالی اور اُس وقت تک راج کرتی رہی جب تک اُس کا بیٹا دوار کر سین پچیس سال کی عُمر کو نہیں پہنچ گیا۔

ہرش وَردَھن

چندر گُپت بکرماجیت گُپت خاندان کی طاقت کا سورج تھا۔ اُس کے سامنے چھوٹے چھوٹے راجاؤں کی کوئی حیثیت ہی نہ تھی۔ وہ راجا بھی جو اُس کے باج گزار نہیں تھے، اُس سے دُشمنی مول لینے کا حوصلہ نہیں رکھتے تھے۔ مگر بکرماجیت کی موت کے ساتھ ہی اِس سلطنت کو گہن لگنا شروع ہو گیا۔ بکرماجیت کا بیٹا کمار گُپت اگرچہ حوصلہ مند اور دلیر راجا تھا اور اس نے اپنی سلطنت کی شان قائم رکھنے کے لیے راجا بندھو ورمن کے ساتھ ایک کامیاب جنگ بھی لڑی مگر اُس کے

آخری دِنوں میں سلطنت کی مغربی سرحدوں پر ہُن قبائل نے حملے شروع کر دیے اور کمار گُپت اِس حالت میں دُنیا سے رُخصت ہوا کہ اس کا بیٹا سکندر گُپت ہُن قبائل کے ساتھ جنگ میں مصروف تھا۔

سکندر گُپت ایک نہ دو پورے دس سال تک ہُنوں کا مُقابلہ کرتا رہا۔ پھر حالات بگڑنے شروع ہو گئے۔ ہُن پہلے سے کہیں زیادہ تعداد میں جمع ہو کر حملے کرنے لگے۔ اِدھر سکندر گُپت کے سوتیلے بھائی پورو گُپت نے مگدھ میں اپنی علیحدہ حکومت قائم کرلی۔ اکیلے ہُنوں کا مُقابلہ کرنا سکندر گُپت کے بس کی بات نہ تھی۔ وہ اُن سے مقابلہ کرتے ہوئے مارا گیا۔

ہُنوں نے پہلے تو گُپت سلطنت کے مغربی علاقوں پر قبضہ کیا اور پھر اُس سلطنت کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے رکھ دیے۔ ہُنوں کا دوسرا گروہ فارس اور گندھارا کو روندتا ہوا اُن سے آملا اور پھر دونوں گروہوں نے ایک ہُن سردار تورمان کی سرکردگی میں وندھیاچل تک اپنی حکومت قائم کرلی۔ نسلی طور پر یہ ہُن قبیلے

منگولیا کے جنگجُو اور خانہ بدوش ساکاؤں سے تعلّق رکھتے تھے، مگر ساکاؤں سے کہیں زیادہ وحشی اور خونخوار تھے۔ تورمان کے مرنے کے بعد اُس کے بیٹے مہر گُل نے گدّی سنبھالی اور سیالکوٹ کو اپنی راجدھانی بنایا۔ میناندر کے بعد یہ دوسرا غیر ملکی راجا تھا جس نے سیالکوٹ کو اپنی راجدھانی بنایا تھا۔ مگر اسے میناندر کے ساتھ کوئی نسبت نہ تھی۔ میناندر کے بر عکس مہر گُل سخت ظالم اور خونخوار حکمران تھا۔ اُس نے بُدھ مت کی خانقاہوں کو تباہ و برباد کر دیا اور لوگوں پر ایسے ایسے ظُلم توڑے جِن کو سُن کر کلیجا مُنہ کو آتا ہے۔ وہ بے زبان جانوروں کو بھی نہیں بخشتا تھا۔ اور بھاری بھر کم ہاتھیوں کو پہاڑی چوٹیوں سے نیچے گِرا کر بہت خوش ہوتا تھا۔ ایک بار کشمیر میں ہستی ونج کے مقام پر، پیر پنجال کی پہاڑیوں پر سے ایک نہ دو پورے ایک سو ہاتھی اُس کی خوشی کی خاطر نیچے کھڈوں میں لڑھکا دیے گئے اور وہ اُن کی چنگھاڑیں سُن کر دیر تک قہقہے لگاتا رہا۔

آخر مُلک کے باقی راجاؤں نے مالوہ کے راجا لیشو دھرمن اور مگدھ کے راجا بالا دیتہ کے ساتھ مل کر مہر گُل کے خلاف جنگ کی اور اُسے کہروڑ کے مقام پر

شکست دی۔ وہ کشمیر بھاگ گیا۔ وہاں کے راجا نے اُس کے ساتھ بڑا اچھّا سلوک کیا مگر اِس ظالم نے موقع پا کر اُسے قتل کر دیا اور خود وہاں کا راجا بن بیٹھا۔ لیکن اُس کے ظُلم کی ناؤ بھر چکی تھی۔ چند سال کی حکومت کے بعد ہی موت نے اسے آ لیا۔ اِس کے بعد راج گدّی اُس کے چھوٹے بھائی نے سنبھال لی۔

ایک بار پھر سارا ہندوستان چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بٹ چکا تھا اور اِن ریاستوں کے راجا آپس میں لڑتے بھڑتے رہتے تھے۔ اِن ریاستوں میں سے تین ریاستیں ایسی تھیں جو دوسروں کے مُقابلے میں ذرا بڑی اور طاقت ور تھیں۔ یہ ریاستیں تھیں قنوج، مالوہ اور تھانیسر۔ تھانیسر کے مغرب میں وہ علاقہ تھا جس پر ہُنوں کی حکومت تھی۔ مشرق میں سُکھاری راجاؤں کی ریاست قنوج تھی اور جنوب میں مالوہ کی ریاست تھی۔

اِن تینوں ریاستوں کے راجاؤں کی آپس میں رشتے داریاں تھیں، بلکہ رشتے داریوں کا یہ سِلسِلہ مگدھ تک پھیلا ہوا تھا۔ تھانیسر کے راجا پربھاکر وردھن کی

ماں مگدھ کے راجا دامودر گُپت کی بیٹی تھی۔ پربھاکر کی اپنی شادی مالوہ کے راجا یشودھرمن کی بیٹی یاسومتی سے ہوئی تھی اور پربھاکر کی اپنی بیٹی راجیہ سری کی شادی قنوج کے راجا گراہاورمن سے ہوئی تھی جو آونتی ورمن لکھاری کا بیٹا تھا۔

پربھاکر کے اپنے دو بیٹے تھے، راجیہ وردھن اور ہرش وردھن۔ پربھاکر نے چاروں طرف اپنی بہادری اور حوصلہ مندی کی دھاک بٹھا رکھی تھی۔ وہ ایک ایسا شیر تھا جس کے سامنے خونخوار اور وحشی ہُن بھی سہمے رہتے تھے۔ گندھارا تک کا حکمران اُس سے ٹکر لیتے ہوئے گھبراتا تھا۔ اُس کے مرنے کے بعد اس کا بڑا لڑکا راجیہ وردھن گدّی پر بیٹھا اور پہلے دِن ہی سے اُس کے لیے مُصیبتوں کا آغاز ہو گیا۔

اس وقت مالوہ کی راج گدّی پر راجا دیو گُپت راج کر رہا تھا۔ اُس نے کوڈا (بنگال) کے راجا ساسانیکا کے ساتھ مل کر قنوج پر حملہ کر دیا اور گراہاورمن کو قتل کر کے اُس کی بیوی راجیہ سری کو قید کر لیا، کیونکہ وہ خود ایک مدّت سے راجیہ سری کے

ساتھ شادی کرنے کی خواہش رکھتا تھا۔ راجیہ وردھن کو اپنی بہن کے بیوہ ہونے کی خبر ملی تو وہ فوراً فوج لے قنوج کی طرف روانہ ہوا اور وہاں سے دیو گُپت کو نکال دیا۔ مگر کوڈا کے راجا ساسانیکا نے اُسے دیو گُپت کے ساتھ صلح کرانے کے بہانے اپنے پاس بُلایا اور قتل کرا دیا۔

راجیہ وردھن کے کوئی اولاد نہ تھی۔ اِس لیے راج گدّی ہرش نے سنبھالی۔ اِس وقت اُس کی عمر سولہ سترہ سال سے زیادہ نہ تھی مگر وہ اُس پر بھاکر وردھن کا بیٹا تھا جس کے نام سے خونخوار اور وحشی ہُن بھی کانپتے تھے۔ راج گدّی سنبھالتے ہی اُس نے اپنے بہنوئی اور بھائی کے قاتلوں سے انتقام لینے کی ٹھانی۔ اِس نے اپنے ایک جرنیل بھنڈی کو فوج دے کر ساسانیکا کی طرف روانہ کیا اور خود قنوج کی طرف بڑھا تاکہ راجیہ سری کو رہا کرا سکے جو دیو گُپت کی قید میں تھی۔

قنوج پہنچ کر اُسے معلوم ہوا کہ جب راجیہ وردھن نے قنوج پر حملہ کر کے دیو گُپت کو وہاں سے نکال دیا تھا تو اِس پہلے ہی راجیہ سری کسی نہ کسی طرح دیو گُپت کی

قید سے نکل بھاگنے میں کامیاب ہوگئی تھی مگر کسی شہر کی طرف جانے کے بجائے اُس نے جنگلوں کا رُخ کیا تھا اور اب کسی کو پتا نہ تھا کہ وہ کہاں ہے؟

ہرش وردھن نے سخت جان سپاہیوں کا ایک دستہ ساتھ لیا اور اپنی بہن کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ راجیہ کی تلاش میں جنگل جنگل پھِرتا وہ اپنے سپاہیوں سے بھی بِچھڑ گیا، مگر اُس نے ہمّت نہ ہاری۔ بھُوک پیاس کی تکلیفیں اُٹھاتا، جنگلی درختوں کے پھل اور پتّے کھاتا، ندی نالوں کا پانی پیتا، اپنی دُھن میں مست جنگل جنگل اپنی بہن کو تلاش کرتا رہا۔ مگر آخر وہ آدمی کا بچّہ تھا، دیو نہ تھا۔ سولہ سترہ سال کی عُمر ہی کیا ہوتی ہے۔ اُس کے بدن کی طاقت آہستہ آہستہ جواب دینے لگی اور پھر ایک شام وہ سفر کی تھکاوٹ سے بے ہوش ہو کر گِر پڑا۔

ہرش اور راجیہ سری

اُجیّن میں مہاراجا بکرماجیت کے محل سے آنے کے بعد ہم نے کِسی راجا کے محل کا رُخ نہیں کیا تھا، بلکہ جنگل جنگل، بستی بستی پِھرتے رہے تھے۔ اِس طرح پھرتے پھراتے ہمیں عرصہ ہو گیا تھا اور اِس عرصے میں مُلک کا نقشہ کُچھ سے کُچھ ہو چکا تھا۔ چوڑے سینوں، چپٹی ناکوں اور اندر کو دھنسی ہوئی سیاہ آنکھوں والے وحشی ہُنوں نے گُپت سلطنت کی اینٹ سے اینٹ بجادی تھی۔ اِس افراتفری سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے کئی باج گزار راجا خُود مختار ہو گئے تھے اور کئی ایک نے لُوٹ کے

مال کی طرح اڑوس پڑوس کے علاقوں کو ہتھیا لیا تھا۔ جگہ جگہ چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم ہو گئی تھیں۔ اُن کے راجا کبھی تلواریں سونت کر ایک دوسرے کے مُقابلے پر آ جاتے اور کبھی آپس میں رشتہ داریاں قائم کر لیتے۔

پہلے بھی یہی ہوتا رہا تھا اور اب بھی یہی ہو رہا تھا، مگر ہمیں اِس تماشے سے نہ پہلے دلچسپی رہی تھی اور نہ اب تھی۔ یہ تو قُدرت کی اَن دیکھی طاقتیں تھیں جو ہمیں راجاؤں کی دُنیا میں گھسیٹ لائی تھیں اور پھر نہ جانے کہاں کہاں لیے پِھرتی رہی تھیں۔ مگر اب کہ ہمیں کسی راجا کی صورت دیکھے ایک لمبا عرصہ ہو گیا تھا، میرے دِل کو یہ اطمینان سا ہونے لگا تھا کہ شاید ہم ہمیشہ کے لیے راجاؤں کی اِس دُنیا سے نکل آئے ہیں جہاں بھائی بھائی کا بیری ہوتا ہے۔ جہاں اپنی گردن بچانے کے لیے بھائی کا گلا کاٹنا پڑتا ہے، جہاں بیٹا باپ کو قتل کر کے اس کی راج گدّی سنبھالتا ہے اور جہاں اپنا خُون ہی سب بڑا دُشمن ہوتا ہے۔ مگر یہ صرف میرا اپنا خیال تھا، قُدرت کی اَن دیکھی طاقتیں کسی اور ہی خیال میں تھیں۔

ہم پھِرتے پھراتے ایک گھنے جنگل سے گُزر رہے تھے کہ ایک درخت کے نیچے کسی کو لیٹے پایا۔ ہم حیران تھے یہ کون ہے جو درخت کے نیچے یُوں مزے سے لیٹا ہوا ہے! قریب جا کر دیکھا تو ہماری حیرانی اور بھی بڑھ گئی۔ یہ سولہ سترہ سال کا ایک نوجوان تھا۔ اُس کا لباس اگرچہ جگہ جگہ سے پھٹا ہوا تھا مگر یہ پھٹا ہوا لباس بھی صاف کہہ رہا تھا کہ یہ کسی جھونپڑی کا نہیں، کسی محل کا چراغ ہے۔

نوجوان کے ہوش تھا۔ سارنگ بابا نے اُس کے مُنہ پر پانی کے چھینٹے دیے تو اُسے ہوش آ گیا۔ ہم نے اُسے کُچھ پھل کھلائے، ندی کا تازہ پانی پلایا تو اُس کی جان میں جان آئی۔ سارنگ بابا نے بڑے پیار سے اُس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور پوچھا۔

"اے نوجوان! تُم کون ہو اور یہاں کیسے آئے؟" یہ سُن کر نوجوان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور اُس نے اپنی ساری کہانی سُنا ڈالی۔ وہ تھانیسر کی راج گدّی کا مالک ہرش تھا اور اپنی بہن راجیہ سری کو تلاش کرتا پھر رہا تھا۔ مگر اب وہ چار قدم بھی نہیں چل سکتا تھا اُس کے سپاہی اُس سے بچھڑ چکے تھے اور اُسے راجیہ سری کا

اب تک کوئی پتا نہیں چلا تھا۔

سارنگ بابا نے اُسے دِلاسا دیتے ہوئے کہا۔ ”غم نہ کرو، نوجوان۔ ہم تمہاری مدد کریں گے۔ اِس لیے نہیں کہ تُم تھانیسر کی راج گدّی کے مالک ہو یا راجا پربھاکر وردھن کے بیٹے ہو، بلکہ اِس لیے کہ تُم اپنی بہن کی تلاش میں نکلے ہو۔ اطمینان رکھو، تمہاری بہن مل جائے گی۔“

”مُجھے اُس کا پتا بتا دیجیے، بابا جی۔“ ہرش نے کہا۔ ”میں خود اُس کے پاس پہنچ جاؤں گا۔“

”اپنی بہن کا اتا پتا جاننا چاہتے ہو؟“ سارنگ بابا نے کہا۔ یہ کہہ کر اُنہوں نے آنکھیں بند کر لیں اور ذرا دیر بعد بولے۔

”تو سُنو! اِس وقت وہ یہاں سے سینکڑوں میل دور وندھیاچل کے جنگل میں۔۔۔۔۔۔“

"وندھیاچل کے جنگلوں میں!" ہرش نے حیرانی سے کہا۔ "مگر وہ اتنی دور پہنچ کیسے گئی؟"

"قُدرت نے اُسے وہاں پہنچادیا ہے۔" سارنگ بابا بولے۔

"مگر میں وہاں کیسے پہنچ سکوں گا؟"

سارنگ بابا مُسکرادیے۔ "گھبراؤ نہیں، قُدرت تمہیں بھی وہاں پہنچا سکتی ہے، ابھی پہنچاسکتی ہے۔"

یہ کہہ کر سارنگ بابا مُجھ سے مخاطب ہوئے۔ "انوشا بیٹے! ذراتکلیف کر کے دیکھو توسہی کہ اِس نوجوان کی بہن وندھیاچل کے جنگل میں کیا کر رہی ہے؟"

"مُجھے بھی ساتھ لے چلیے۔" ہرش نے کہا۔

سارنگ بابا بولے۔ "ٹھیک ہے۔ انوشا بیٹے کے ساتھ تُم بھی جاؤ اور دیکھو کہ تمہاری بہن وندھیاچل کے جنگلوں میں کس حال میں ہے۔ بلکہ ہم بھی تمہارے

ساتھ چلتے ہیں۔"

سارنگ بابا نے ہرش کا ایک ہاتھ تھام لیا، دوسرا ہاتھ میں نے تھاما اور اِس کے ساتھ ہی ہم پلک جھپکتے میں وندھیاچل کے جنگل میں پہنچ گئے۔

ہم گھنے جنگل کے درمیان ایک کھلی جگہ میں تھے۔ ہم سے کوئی پچاس قدم دُور لکڑیوں کی ایک چِتا جل رہی تھی اور ایک عورت اُس جلتی ہوئی چِتا میں کودنے کے لیے آگے بڑھ رہی تھی۔ ہرش تیزی سے اُس کی طرف بھاگا۔

"راجیہ سری! راجیہ سری رُک جاؤ، راجیہ سری!"

عورت چِتا میں چھلانگ لگانے ہی والی تھی کہ ہرش نے اُس کا بازو تھام لیا۔

"نہیں راجیہ سری، میں تمہیں چِتا میں جلنے نہیں دوں گا۔ تمہیں زندہ رہنا ہو گا۔"

راجیہ سری نے پلٹ کر ہرش کی طرف دیکھا اور اپنا بازو چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔ "نہیں ہرش بھیّا! مجھے جل جانے دو، میرا سہاگ لُٹ چُکا

ہے۔ اب مُجھے زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں۔ چھوڑ دو مُجھے، جل کر بھسم ہو جانے دو۔"

"دیدی!" ہرش نے اُس کے ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔ "میرا اِس دُنیا میں تمہارے سوا کوئی نہیں۔ میرا باپ میری ماں، میرا بڑا بھائی۔۔۔ تُم اُن سب کی جگہ ہو۔ تمہیں زندہ رہنا ہو گا، اپنے لیے نہیں، اپنے چھوٹے بھائی کے لیے۔" "بہت اچھّا۔" راجیہ سری بولی۔ "میں زندہ رہوں گی۔ اپنے لیے نہیں، تمہارے لیے!"

اور یہ کہتے ہوئے اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ہرش اُس کے آنسو پونچھتے ہوئے بولا۔ "تُم کیا جانو میں نے تمہاری تلاش میں کیسے کیسے دُکھ اُٹھائے ہیں۔ میں تو ایک طرح کا مر ہی چکا تھا۔ دُعا دو سارنگ بابا اور انوشا جی کو جو مُجھے پلک جھپکتے میں سینکڑوں میل دور سے یہاں لے آئے ہیں۔ وہ دیکھو!"

یہ کہہ کر ہرش نے ہماری طرف اشارہ کیا۔ راجیہ سری دوڑی دوڑی ہماری طرف آئی اور پھر اُس نے ہمارے قدم لیے۔ سارنگ بابا اُس کے سر پر ہاتھ پھیرتے

ہوئے بولے۔

”جیتی رہو بیٹی، آؤ اب ہم تُم دونوں کو واپس لے چلیں۔“

اور دوسرے ہی لمحے ہم تھانیسر میں، ہرش کے محل میں پہنچ گئے۔

ہرش اور ہیون سانگ

اپنے شوہر گراہاورمن کے بعد راجیہ سری قنوج کی گدّی کی حق دار تھی مگر اُس نے راج گدّی پر بیٹھنے سے انکار کر دیا۔ چنانچہ ہرش نے تھانیسر کی ریاست کے ساتھ ساتھ قنوج کی ریاست کو بھی اپنے انتظام میں لے لیااور راجیہ سری کے نام پر حکومت کرنے لگا۔ صرف یہی نہیں، اُس نے تھانیسر کے بجائے قنوج ہی کو اپنی راجدھانی بنالیا۔

دونوں ریاستوں کے ایک ہو جانے کے بعد ہرش نے اپنی تمام توجّہ فوجی طاقت

بڑھانے پر لگا دی اور جلد ہی ایک مضبوط فوج تیّار کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اِس فوج میں پانچ ہزار ہاتھی، بیس ہزار گھوڑے اور ساٹھ ہزار سپاہی تھے۔

انہی دِنوں چین سے بُدھ مت کا ایک اور عالم ہیون سانگ اُسی راستے سے ہندوستان آیا جس راستے سے اِس سے پہلے فاہیان آیا تھا۔ اُس نے کابل، کشمیر، نالندہ اور کامروپ میں بُدھ مذہب کی تعلیم حاصل کی اور پھر قنوج میں ہرش کے پاس پہنچا اور اُس کے سامنے بُدھ مت کی تبلیغ کی۔ ہیون سانگ کی باتوں سے متاثر ہو کر ہرش اور اُس کی بہن راجیہ سری نے بُدھ مت قبول کر لیا اور اِس کے بعد ہرش نے بھی بُدھ مت پھیلانے میں اُسی طرح سرگرمی دکھائی جس طرح اِس سے پہلے اشوک اور کنشک دِکھا چکے تھے۔

بُدھ مت کے اصولوں میں تبدیلیاں کنشک سے پہلے ہی ہو چکی تھیں اور ہرش کا دور آتے آتے اُس کی حالت کُچھ سے کُچھ ہو گئی تھی۔ وہ گوتم بُدھ جس نے لوگوں کو بُتوں کی پوجا کے گورکھ دھندے سے اور برہمنوں کے شکنجے سے نکالا

تھا، اُس کا مذہب اب خود سادگی کے بجائے پیچیدہ رسموں کا گورکھ دھندا بن گیا تھا۔ کنشک کی طرح ہرش بھی بُدھ مت کے مہایان فرقے کا پیرو تھا۔ کنشک کے عہد میں تو گوتم بُدھ کی پتھّر کی مُورتیاں ہی بنی تھیں مگر اب گوتم بُدھ کے چاندی اور سونے کے بڑے بڑے بُت بننے لگے تھے اور اُن کی پوجا بڑی دھوم دھام سے ہوتی تھی۔ ہرش پر ہیون سانگ کا زبردست اثر تھا، چنانچہ اُس کے اعزاز میں ہرش نے قنوج میں ایک بھاری مجلس منعقد کی اور اُس کے لیے کامروپ سے قنوج تک ایک جلوس نکالنے کا انتظام بھی کیا۔ ہرش اور ہیون سانگ اِس جلوس کے آگے آگے تھے اور بائیس مختلف راجا ہزاروں عالموں فاضلوں کے ساتھ پیچھے پیچھے تھے۔ اِس کے علاوہ اور بے شمار لوگ تھے۔ قنوج میں اِس جلوس کا بڑا زبردست استقبال ہوا۔ جلوس کے بعد مجلس منعقد ہوئی۔ اِس مجلس میں اکتّیس دِن تک بُدھوں، برہمنوں اور جینیوں کے درمیان مذہبی بحثیں ہوتی رہیں۔

ہیون سانگ اور بُدھ مت کی یہ عزّت برہمنوں کی برداشت سے باہر تھی۔ اُنہوں

نے محل کو آگ لگوا دی اور ایک شخص سے ہرش پر قاتلانہ حملہ بھی کرایا، جو ناکام رہا۔ قاتلانہ حملہ کرنے والا شخص پکڑا گیا اور اُس کی نشاندہی پر اُن تمام برہمنوں کو سزا دی گئی جو اِس سازش میں شریک تھے۔

قنوج کی مجلس سے فارغ ہوتے ہی ہرش نے پریاگ کا رُخ کیا جہاں وہ ہر پانچ سال بعد اپنا سب کُچھ لوگوں میں تقسیم کر دیتا تھا یہاں تک کہ اپنے پہننے کے کپڑے بھی اُتار کر دے دیا تھا۔ خیرات کا یہ سِلسِلہ ڈھائی مہینے جاری رہا۔ پریاگ کی اِس تقریب کے ختم ہونے کے بعد ہیون سانگ نے واپس اپنے وطن کی راہ لی اور پھر اُس نے بھی اپنے سفر کے حالات لکھے، بالکل اُسی طرح جس طرح بکرماجیت کے دور میں آنے والے فاہیان نے لکھے تھے۔

ہرش کے دربار میں، چندر گُپت بکرماجیت کی طرح، اُس وقت کے چوٹی کے عالم، شاعر، فلسفی، مصوّر اور ناٹک لکھنے والے آ جمع ہوئے تھے۔ اُس کے دربار کا سب سے بڑا شاعر بان بھَٹ تھا۔ اُس نے ہرش چرتّر کے نام سے ہرش کی زندگی کے

حالات نظم میں بیان کیے۔ اُس نے ایک ناٹک کاومبری بھی لکھا تھا۔ خود ہرش ایک اُونچے درجے کا شاعر تھا اور اُس نے تین ٹانک ناگ نند، رتناولی اور پریا دارسیکا لکھے تھے۔

وہ عالموں، فاضلوں، شاعروں اور ڈرامہ نگاروں کو بھاری انعامات دیتا تھا اور اُس کی آمدنی کا چوتھائی حصّہ انہی انعامات کے دینے میں اُٹھ جاتا۔ وہ مسلسل اپنی سلطنت کے مختلف علاقوں کا دورہ کرتا رہتا تھا تھے اور لوگوں کی شکایتیں موقع پر ہی دور کر دیا تھا۔ وہ جہاں کہیں ٹھہرتا، وہاں اُس کے لیے بانس اور سرکنڈوں کی ایک جھونپڑی بنادی جاتی، جہاں وہ لوگوں سے ایک عام آدمی کی طرح ملتا تھا۔ اُس کے جانے کے بعد اُس جھونپڑی کو جلادیا جاتا تھا۔ اُس کے افسر بھی اپنا اپنا کام ایمان داری اور چُستی سے انجام دیتے تھے۔

جب چالیس سال تک راج کرنے کے بعد یہ راجا اِس دُنیا سے رُخصت ہوا تو خزانے میں پھوٹی کوڑی تک نہ تھی۔ اُس کی آنکھیں بند ہوتے ہی راج گدّی پر

اُس کے وزیر ارجن نے قبضہ کر لیا۔ مگر اُس میں ہرش جیسی کوئی بات بھی نہ تھی۔ چنانچہ وہ راجا جو ہرش کی اطاعت کا دم بھرتے تھے، خُود مختار ہو گئے اور سارا ملک، پُورب سے پچھّم تک، ایک بار پھر اُسی طرح چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بٹ گیا جس طرح ہرش کے راج گدّی سنبھالنے سے پہلے تھا۔۔ اور پہلے کی طرح اِن ریاستوں کے راجا کبھی تلواریں سونت کر ایک دوسرے کے مُقابلے پر آجاتے تھے اور کبھی آپس میں رشتے ناتے کرنے لگتے تھے۔

چاند دو ٹکڑے ہو گیا

گنگا جمنا اور برہم پُتر کے پانیوں سے بہت دُور، دریائے نربدا بلکہ اِس سے بھی آگے کرشنا ندی اور کاویری ندی کے پار، مُلک کے انتہائی جنوب مغربی کونے میں، مالا بار کی ریاست تھی، جس پر چیرا خاندان کے راجا زمُورن پرمال کا راج تھا۔ چکرو رتی اُس کا لقب تھا اور چیرا خاندان کا راجا ہونے کی وجہ سے اُسے چیرومن بھی کہا جاتا تھا۔

سینکڑوں برسوں سے مالا بار کے لوگ عرب، مصر، روم اور یونان کے لوگوں کے

ساتھ تجارت کر رہے تھے۔ قسم قسم کی چیزوں سے لدے ہوئے جہاز مالا بار آتے اور یہ چیزیں مالا بار سے ہوتی ہوئی سارے ملک میں پہنچتی تھیں۔ گرم مسالے، ہاتھی دانت، قیمتی ہیرے جواہرات، ململ، موتی، ریشم اور دوسری بہت سی چیزوں سے بھرے ہوئے جہاز مالا بار سے عرب، مصر، روم، یونان اور دوسرے ملکوں کو جاتے تھے۔

ہر سال پچھتّر لاکھ روپے کے لگ بھگ مال کا لین دین یہاں ہوتا تھا۔ عرب اور مصر کے سوداگر مالا بار میں یوں پھِرتے نظر آتے تھے جیسے وہیں کے رہنے والے ہوں۔ روم اور یُونان کے تاجروں نے تو وہاں اپنی باقاعدہ بستیاں بسا رکھی تھیں۔

چیرا خاندان کی ریاست کی حدیں چولا اور پانڈیا ریاستوں سے ملتی تھیں، مگر چیرا راجاؤں کو اپنی ریاست حدیں بڑھانے یا دوسری ریاستوں کے ساتھ اُلجھنے کا کوئی شوق نہ تھا۔ مالا بار میں ہونے والی تجارت کی آمدنی ہی اُن کے لیے کافی تھی۔ لوگ اِس تجارت سے خوش حال تھے اور اُن کا دھیان تجارت کے سوا اور کسی

طرف جاتا ہی نہیں تھا۔

مہا راجا اشوک کے زمانے ہی میں بُدھ مت مالا بار اور اِس سے آگے سراندیپ (لنکا) تک پھیل چکا تھا۔ مالا بار کے لوگ اُسی زمانے سے بُدھ مت کے پیرو چلے آ رہے تھے۔ خود راجا زَمُورن پر مال بُدھ مت کا پیرو تھا۔ چنانچہ جب ہرش نے ہیون سانگ کے اعزاز میں اپنی راجدھانی قوج میں بدھ مت کی بھاری مجلس منعقد کی تو دوسرے راجاؤں کی طرح مالا بار کا راجا بھی اِس میں شامل ہوا۔ مگر اُس کے مجلس میں شامل ہونے سے پہلے ہی قُدرت کی اَن دیکھی طاقتوں نے اُس کی ایک جھلک مُجھے دِکھادی تھی۔ بہت دِنوں پہلے میں نے اُسے ایک خواب میں دیکھا تھا اور میرا یہ خواب بڑا ہی عجیب تھا۔

رات آدھی سے زیادہ گُزر چکی تھی۔ راجا بڑی بے قراری سے اپنے محل کی چھت پر ٹہل رہا تھا۔ کوئی انجانی، اَن دیکھی طاقت اتنی رات گئے اُسے اپنے نرم نرم بستر سے نکال کر محل کی چھت پر لے آئی تھی۔ آسمان پر چودھویں کا چاند چمک رہا تھا

اور اُس کی اُجلی اُجلی چاندنی سے ساری دُنیا دُودھ میں نہائی معلوم ہوتی تھی۔ دُور دُور تک پھیلا ہوا سمندر اُس اُجلی اُجلی چاندنی میں چاندی کا ایک بہت بڑا تھال دِکھائی دیتا تھا۔ سمندر کی لہریں جب راج محل کی سیڑھیوں سے ٹکراتی تھیں تو یوں آواز آتی تھی جیسے کئی ہزار کمانوں سے ایک ساتھ تیر چھوڑے گئے ہوں۔ محل کی سیڑھیاں سمندر کے پانی میں دُور تک چلی گئی تھیں۔ لہروں کے شور کے ساتھ جب کوئی مچھلی اوپر اُچھلتی تھی تو یوں لگتا تھا جیسے سمندر نے ایک بھالا آسمان کی طرف اُچھال دیا ہے۔

ہروں کے اِس شور سے راجا کی بے چینی اور بے قراری اور بڑھتی جا رہی تھی۔ اُس کا دِل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ یُوں لگتا تھا جیسے کُچھ ہونے والا ہے۔۔۔ کیا ہونے والا ہے؟ اِس کی اُسے کُچھ خبر نہ تھی۔ وہ تو بے چینی سے ٹہلتے ہوئے کبھی آسمان پر جگمگاتے چاند کو دیکھتا تھا اور کبھی چاندی کے تھال کی طرح چمکتے ہوئے سمندر کو۔ آسمان سے ہوتے ہوئے اُس کی نظریں سمندر کی طرف آتی تھیں اور سمندر کی لہروں سے ہوتی ہوئی پھر آسمان کا چکّر کاٹنے لگتی تھیں۔ مگر ایک بار جو

اُس کی نظریں سمندر کی لہروں پر سے ہوتی ہوئی آسمان کی طرف اُٹھیں تو وہیں گڑ کر رہ گئیں۔ آسمان پر جگ مگ جگ مگ کرتا چاند اچانک دو ٹکڑے ہو گیا۔ پہلے تو اُس نے یہ سمجھا کہ چاند کو گرہن لگ گیا ہے مگر یہ گرہن نہ تھا۔ چاند کے دونوں ٹکڑے ایک دوسرے سے کافی فاصلے پر صاف دِکھائی دے رہے تھے۔ ایک ٹکڑا محل کے ایک طرف نظر آ رہا تھا اور دوسرا ٹکڑا محل کے دوسری طرف۔ راجا نے اُسے اپنی نگاہوں کا وہم سمجھا۔ اُس نے اپنی آنکھیں ملیں اور جب اُسے یقین ہو گیا کہ یہ وہم نہیں بلکہ سچ مُچ چاند دو ٹکڑے ہو گیا ہے تو اُس کے دِل پر خوف چھا گیا اور وہ تھر تھر کانپتے ہوئے محل کی چھت پر مُنہ کے بل گِر پڑا۔ مگر اِس حالت میں بھی اُس کی نظریں چاند کے ٹکڑوں پر جمی ہوئی تھیں۔

اور پھر راجا نے دیکھا کہ چاند کے دونوں ٹکڑے کُچھ دیر الگ الگ رہنے کے بعد آہستہ آہستہ ایک دوسرے کے قریب آئے اور پھر آپس میں جُڑ گئے۔ راجا بڑی دیر تک محل کی چھت پر اِسی حالت میں پڑا چاند کی طرف دیکھتا رہا۔ میں نے راجا کا سارا حال خواب میں دیکھا تھا۔ اُس کا حیران پریشان چہرہ میرے دِل پر

نقش ہو کر رہ گیا تھا، مگر جب میں نے اپنا یہ خواب دارنگ بابا کو بتایا تھا تو خواب

سُن کر اُنہوں نے اپنی زبان سے ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا۔ بالکل خاموش رہے

تھے۔ اور میں یہ سمجھ بیٹھا تھا کہ میرا یہ خواب محض ایک خواب ہے اور سارنگ

بابا کے نزدیک اِس کی کوئی اہمیت نہیں۔

پھر جب میں نے اُس راجا کو دُوسرے راجاؤں کے ساتھ قنوج میں دیکھا تو پہلی ہی

نظر میں پہچان گیا۔ مگر اِس سے پہلے کہ میں سارنگ بابا کو اِس کے بارے میں

بتاتا، وہ خود ہی راجا کی طرف اِشارہ کرتے ہوئے بولے۔

"انوشا بیٹے! کیا یہی ہے وہ راجا جسے تُم نے خواب میں دیکھا تھا؟"

"جی مہاراج!" میں نے جواب دیا۔

میرا خیال تھا کہ اِس کے بعد سارنگ بابا کُچھ اور پوچھیں گے، راجا کے سِلسلے میں یا

میرے خواب کے بارے میں کوئی اور بات کریں گے، مگر اُنہوں نے نہ کُچھ اور

پوچھا اور نہ کوئی اور بات کی۔ اُن کی اِس خاموشی نے مُجھے سخت اُلجھن میں ڈال دیا۔

راجا تو قنوج کی مجلس ختم ہونے کے بعد واپس ہو گیا مگر ہم ہرش کے ساتھ ہی پریاگ گئے۔ پریاگ میں ڈھائی مہینے تک خیرات کرنے کے بعد ہرش قنوج کی طرف واپس ہونے لگا اور ہیون سانگ نے وطن کی راہ لی تو ہم بھی ہرش سے رُخصت ہو کر جنوب کی طرف ہو لیے۔ ہماری نئی منزل کہاں؟ کہیں تھی بھی یا نہیں؟ سارنگ بابا نے ابھی مُجھے اِس بارے میں کُچھ نہیں بتایا تھا۔

مگر جب ہم وندھیاچل کے دامن میں چُنبل ندی کے کنارے واقع شہر دھارا نگر کے قریب پہنچے تو سارنگ ایک بڑ کے درخت کے نیچے جا کر رُک گئے۔ یہ درخت شہر کے بڑے دروازے سے کوئی آدھ کوس دور تھا۔ اِس درخت کے نیچے پہنچ کر سارنگ بابا نے کہا:

"سمجھ جاؤ گے۔" سارنگ بابا بولے۔ "سب کُچھ سمجھ جاؤ گے۔ جب تُم نے مُجھے

اپنا خواب سُنایا تھا تو اُسی وقت مُجھے معلوم ہو گیا تھا کہ اِس دُنیا میں میرا سفر ختم ہونے والا ہے۔ تمہارا خواب سُننے کے بعد میرا کام صرف اتنا تھا کہ اِس راجا کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لوں جِس نے اپنی آنکھوں سے چاند کو دو ٹکڑے ہوتے دیکھا ہے، اور پھر تمہیں اُس کے پاس پہنچا دوں۔ مگر ایسے نہیں، جیسے تُم شیل شر نگن کی پہاڑی سے جہلم کے کنارے یا ٹیکسلا سے پشکلاوتی پہنچ جاتے تھے، بلکہ اِس طرح جیسے تُم شیش ناگ کے بیٹے کی امداد کرنے ٹیکسلا سے یاتریوں کے قافلے کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے پاٹلی پُتر پہنچے تھے۔ تمہارے بارے میں بجرنگ نجومی نے جو کُچھ کہا تھا، اُس کا ایک ایک حرف پورا ہوا ہے۔ پورس سے لے کر ہرش تک چھوٹا بڑا کوئی راجا ایسا نہیں جس نے تمہارے اور تمہارے سارنگ بابا کے سامنے سر نہ جھکایا ہو۔ مگر مالابار کا راجا زَمُورن پرمال ایسا راجا ہے جس کے سامنے ہم خود اپنا سر جھکاتے ہیں۔ قُدرت نے اُس کے دامن میں وہ دولت ڈالی ہے جس سے ہمارا دامن خالی ہے۔ گو ہم نے خود چاند دو ٹکڑے ہوتے نہیں دیکھا مگر مُجھے اِس بات کے سچّے ہونے میں ذرا بھی شک نہیں۔ میرا دل اِس بات کی گواہی دیتا

ہے کہ قُدرت کی طرف سے کوئی بہت بڑا نشان ہے۔ کیسے اچھّے ہوں گے وہ لوگ جو اِس نشان کو دیکھ کر اندھیرے سے اُجالے میں آ جائیں گے اور کیسے بد قسمت ہوں گے وہ جو اِس نشان کو دیکھ کر بھی اندھیروں ہی میں رہیں گے۔"

"مگر اس نشان کا مطلب کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔ "اِس نشان کا مطلب تمھیں یہاں نہیں، مالابار پہنچ کر معلوم ہو گا، انوشا بیٹے۔ قُدرت اپنے بھید وقت پہلے کسی پر نہیں کھولتی، میں چاہوں بھی تو نہیں بتا سکتا، اِس لیے کہ میرا سفر یہاں ختم ہو جاتا ہے۔ آگے تُم اکیلے جاؤ گے اور مالابار میں راجا زَمُورن پرمال کے محل میں پہنچو گے۔ اپنی کرامتیں دِکھانے کے لیے نہیں بلکہ راجا کی خدمت کرنے کے لیے۔ بالکل اُسی طرح جس طرح ایک نوکر اپنے مالک کی خدمت کرتا ہے۔ تمھیں کیا کرنا ہے، یہ تمھیں وہاں پہنچ کر معلوم ہو جائے گا۔ بس اب آخری بار اپنے بابا سے گلے مل لو اور پھر آگے چلنے کی تیّاری کرو۔"

میں رو دیا۔ "بابا! آپ مجُھے یوں چھوڑ کر تو نہ جائیں!"

”روؤ نہیں، انوشا بیٹے۔“ سارنگ بابا نے میرے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ ”جتنا ساتھ ہمارا اور تمہارا رہا ہے تو شاید ہی کسی کو میسّر آیا ہو۔ مگر ساتھ آخر ٹوٹ رہتا ہے، اس لیے کہ دُنیا کی رِیت یہی ہے۔ یہاں آنے والے کو ایک نہ ایک دِن یہاں سے جانا ہوتا ہے، چاہے کوئی سو برس جی لے، چاہے ہزار برس۔ مگر تُم گھبراؤ نہیں۔ میرا جسم تُم سے جُدا ہو رہا ہے، میری روح برابر تمہارے ساتھ رہے گی۔ لو، اب ہنستے مُسکراتے ہوئے اپنے بابا کو رُخصت کرو۔“

یہ کہتے ہوئے سارنگ بابا زمین پر لیٹ گئے اور اپنی گیروے رنگ کی چادر اوڑھ لی۔ دوسرے ہی لمحے اُن کا جسم بے جان ہو چُکا تھا۔ ہمیشہ کے لیے۔۔۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے!

سارنگ بابا کی آخری نصیحت کے باوجود میں، دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ مُجھے یوں لگا جیسے میری ماں نے آج ہی دم توڑا ہے، جیسے میری خالہ اور میری مامی آج ہی اِس دُنیا سے رخصت ہوئی ہیں۔۔۔ میرے سارے زخم ایک دم ہرے ہو

گئے تھے۔

میری چیخوں کی آواز نے چند راہ گیروں کو اپنی طرف متوجّہ کر لیا اور جلد ہی دھارا نگر کے لوگوں کو یہ خبر ہو گئی کہ سارنگ بابا اِس دُنیا سے چل بسے ہیں۔

دھارا نگر کے بڑے بوڑھے سارنگ بابا اور انوشا کے نام اور کام سے ناواقف نہ تھے۔ اُنھوں نے بڑی عقیدت سے سارنگ بابا کے جسم کو غسل دیا اور اُس کے لیے چندن کی خوشبو دار لکڑی کی چِتا تیّار کی۔ مگر سارنگ بابا کا جسم چِتا پر رکھ کر اُنھوں نے چِتا کی لکڑیوں کو آگ لگائی تو آگ اُن کے جسم کا کُچھ بھی نہ بگاڑ سکی!

لوگوں کی نظر میں یہ سارنگ بابا کی بہت بڑی کرامت تھی کہ آگ نے اُن کے جسم کو چھُونے سے اِنکار کر دیا تھا۔ وہ حیرانی اور عقیدت بھری نظروں سے اُن کے جسم کو دیکھ رہے تھے۔ اُنھیں حیرت میں ڈوبے ہوئے چھوڑ کر میں نے سارنگ بابا کی لاش چِتا سے نکالی اور اُسی بَڑ کے درخت کے نیچے ایک گڑھا کھود کر، مٹّی میں دبا دی۔

اور پھر میں، سارنگ بابا کے حکم کے مطابق، مالابار کی طرف روانہ ہو گیا، اُس راجا سے ملنے کے لیے جس نے اپنی آنکھوں سے چاند کو دو ٹکڑے ہوتے دیکھا تھا۔

مگر میں دور تک، پلٹ پلٹ کر منوں مٹّی کے اُس ڈھیر کو دیکھتا رہا جس کے نیچے میں اپنے سارنگ بابا کو دبا آیا تھا!